کمرشل انٹرسٹ

کی

فقہی حیثیت

مولانا محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی

ادارۂ ثقافت اسلامیہ پاکستان

ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلہ کمرشل انٹرسٹ کا ہے۔ "کمرشل انٹرسٹ" کا ترجمہ تجارتی سود کیا جاتا ہے جو غلط نہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ "ربوا" اور "سود" کو ایک ہی حقیقت سمجھ لیا گیا ہے اور اسی بنا پر تجارتی سود کو بعض اہل اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔

بعض اوقات مسائل کی صورت بڑی نازک ہوتی ہے اور حق و باطل کے باریک فرق کو محسوس کرنا اور دونوں کے درمیان خط امتیاز کھینچنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ کچھ یہی مشکل "ربوا" اور "ربحؑ" کی ہے۔ دونوں کی سرحدیں متقارب ہیں - ذرا سی لغزش حق کو باطل کے ساتھ ملتمس کر سکتی ہے - حلال کو حرام کہنا بھی ویسی ہی غلطی ہے جیسے حرام کو حلال قرار دینا۔ اگر کسی سے یہ طے کر لیا جائے کہ تمہیں دس کے عوض گیارہ روپے دینے ہوں گے تو یہ ربوا ہو جائے گا اور اگر وہی شخص اپنی خوشی سے دس کے عوض گیارہ دے دے تو یہ سنت ہے' یعنی ذرا سے فرق سے ایک حرام اور دوسرا حلال ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں کمرشل انٹرسٹ کے متعلق اسی قسم کے نازک مباحث ہیں جو وقت کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ بہت کم اہل علم نے ادھر توجہ کی ہے۔

2 روپے

3/-

کمرشل انٹرسٹ
کی
فقہی حیثیت

مرتبہ

مولانا محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ پاکستان
۲۔ کلب روڈ۔ لاہور

طبع اوّل جنوری ۱۹۵۹

تعداد

ایک ہزار

طابع

ناشر

ادارۂ ثقافت اسلامیہ پاکستان

کلب روڈ۔ لاہور

پیش لفظ

ہمارے معاشرے میں جو مسئلہ انتہائی پیچیدہ ہے وہ "تجارتی سُود" کا مسئلہ ہے:۔ ایک طرف اسلام نے واضح لفظوں میں "ربوا" کو حرام قرار دیا ہے اور دوسری جانب عملی زندگی میں بینکنگ اور کمرشل انٹرسٹ (تجارتی سُود) بلکہ سارے نظامِ تجارت کا دار و مدار ہے۔ پھر یہ مسئلہ محض ایک ملک کا داخلی مسئلہ نہیں، بلکہ ساری بین الاقوامی دنیا اس میں گرفتار ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی ملک تمام دوسرے ممالک سے بے تعلق رہ کر کوئی ایسا نظام نہیں چلا سکتا جو سب کی ضد ہو۔ یہ عالمی نظامِ تجارت وہی بدل سکتا ہے جس کے ہاتھ میں تقدیرِ امم ہو اور اس کی ایک حکیمانہ جنبشِ لب ساری دُنیا کے نظامِ تجارت کی کایا پلٹ دے۔ جب تک یہ نہیں ہوتا اُس وقت تک کیا کرنا چاہیئے۔ اور اس کے لئے سندِ جواز کیا ہے؟ یہ ہے وہ سوال جو عرصۂ دراز سے زیرِ غور و بحث رہا ہے۔ لیکن کوئی متفق علیہ اور تسلی بخش فتوے اب تک سامنے نہیں آیا اور مسلمانوں کی اکثریت ہنوز تذبذب کے تیرہ و تار وادی میں بھٹک رہی ہے۔

آپ کو یاد ہوگا۔ ایک زمانے میں بینک کے سُود کے متعلق علماء سے استفتاء کیا گیا۔ یہ انگریزی حکومت کا عہد تھا۔ سوال یہ تھا کہ اگر بینک کا سُود لیتے ہیں

توسُود خواری ہوتی ہے اور اگر نہیں لیتے تو وُہ رقم سُود قانوناً عیسائی مشنری کے حوالے کردی جاتی ہے جو اِسلام اور مسلمانوں کے خلاف اِستعمال ہوتی ہے ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیئے؟ یہ تھا استفتاء اور اس کے جو جوابات شائع ہوئے، وہ یُوں ہیں:۔

(۱) بینک میں روپیہ رکھنا ہی نہیں چاہیئے۔

(۲) سُود لینا حرام ہے چاہے نہ لینے سے کوئی سا نقصان ہوتا ہو۔

(۳) لینے سے چھوڑنا زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اِس لئے "اہون البلیتین" پر عمل کر کے لے لینا چاہیئے۔

(۴) لے لینا جائز ہے۔

پھر یہ سوال ہؤا کہ کیا اسے استعمال کر سکتے ہیں؟ اِس کے بھی کئی جواب تھے، مثلاً:

(۱) لے لینا تو ضروری ہے لیکن اِس کا اِستعمال ناجائز ہے۔

(۲) جب لینا جائز ہے تو اِستعمال بھی جائز ہے۔

پھر سوال ہؤا کہ اگر لے لینا ضروری اور خود استعمال کرنا ناجائز ہو تو اِس رقم کو کیا کرے؟ اس کے بھی کئی جواب آئے۔

(۱) ضائع کردے۔

(۲) کسی دوسرے غریب کے مصرف میں یا رفاہِ عام میں صرف کر دے، مگر

اُمیدِ ثواب نہ رکھے۔

(۳) اسے تبلیغی مصرف میں دیدے یعنی جو کام عیسائی مشنری لیتی ہے وہی تم لو۔

(۴) کسی ایسے مسلمان کو دیدے جو بدقسمتی سے کسی ساہوکار کے پھندے میں پھنسا ہو (قرض کی رقم تو زکوٰۃ وصدقات کی مد سے ادا ہونا چاہیئے اور) جو سود دینا پڑتا ہو وہ سود اسی بینک کے سود سے ادا کرے یعنی مالِ حرام بود بجائے حرام رفت۔ یہ آخری جواب میرا جواب تھا۔

یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب ایک پورے نظام کو بدل ڈالنے کا تصوّر مسلمان نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن پاکستان بن جانے کے بعد مسئلے کی نوعیت بدل گئی ہے۔ عیسائی مشنری میں کوئی رقم جانے کا سوال اس وقت نہیں، اب سوال ہے پورے ملک کے نظامِ تجارت کا جو بغیر "کمرشل انٹرسٹ" کے سردست نہیں چل سکتا، خواہ کمپنی کے ذریعے ہو یا بینک کی معرفت بلکہ اس وقت تو کسی پرائیویٹ کمپنی کو بھی بینک کے ساتھ معاملہ رکھنے سے مفر نہیں۔

"کمرشل انٹرسٹ" اور بینک کے سود پر آج سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے لکھا ہے اور وہ اکثر انگریزی دور کی چیزیں ہیں۔ اگرچہ ان میں وہ نکات بھی موجود ہیں جو اس وقت مشعلِ راہ بن سکیں۔

ہم نے مارچ ۱۹۵۸ء میں ایک مضمون ماہنامہ "ثقافت" میں لکھا تھا جس کا عنوان ہے "**سود خواری کی قسمیں**" (احادیث کی روشنی میں) اس میں

بتایا گیا ہے کہ محض لین دین میں کمی بیشی تو بہت سے مواقع پر عین درست ہے۔ اس لئے ربوا یا سود محض اس کمی بیشی کا نام نہیں۔ بلکہ یہ ایک ذہن اور ایک زاویۂ نظر ہے جو زندگی کے بیشمار گوشوں میں بغیر اس کے کہ اس میں کمی بیشی کا سوال ہو پایا جاتا ہے۔

اس کے بعد جناب سیّد یعقوب شاہ صاحب جنرل آڈیٹر پاکستان کا ایک مضمون سوال نامے کی شکل میں مارچ ۱۹۵۸ء کے "ثقافت" میں شائع ہوا۔ جس میں خاص طور پر تجارتی سود (کمرشل انٹرسٹ) پر گفتگو کی گئی۔ اس کے خاص نکات یہ ہیں کہ کمرشل انٹرسٹ کے وجود کا عہدِ نبوّت میں (بلکہ دسویں صدی عیسوی تک) کوئی سراغ نہیں ملتا لہٰذا جس الربوا کا ذکر قرآن میں ہے اس کا اطلاق بعد کے کمرشل انٹرسٹ پر نہیں ہوتا بلکہ صرف انہیں اقسام ربوا پر ہوگا جو نزولِ قرآن کے وقت موجود تھیں۔ نیز دوسری اور بھی عقلی وجوہ ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کمرشل انٹرسٹ ربوائے ممنوع کی صف میں نہیں آتا اور نیز موجودہ دور میں یہ ایک ملکی و قومی ضرورت بھی ہے۔

اس کے بعد جولائی ۱۹۵۸ء کے "ثقافت" میں ہمارا ایک مفصّل مضمون "کمرشل انٹرسٹ کی دینی حیثیت" کے عنوان سے شائع ہوا جس کا مفاد یہ ہے کہ سُود خواری نام ہے یک طرفہ اور خود غرضانہ نفع اندوزی کا اور "کمرشل انٹرسٹ" میں قرض دینے والے اور قرض لینے والے دونوں کا نفع ہے اور یہ مضاربت یا بیع سَلَم وغیرہ سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔ لہٰذا کمرشل انٹرسٹ "تجارتی ربوا" نہیں بلکہ "تجارتی رُبح" ہے اور اگرچہ ہمارا نصب العین یہی ہونا چاہیئے کہ کسی اشتباہ کی کوئی رمق بھی باقی

نہ رہے۔ تاہم موجودہ حالات میں اسے ربوا قرار دینے کی فقہی بنیاد مضبوط نظر نہیں آتی۔

پھر اکتوبر ۱۹۵۸ء کے ثقافت میں جناب عطاء اللہ صاحب پالوی کا مضمون "سود کا مسئلہ" کے عنوان سے شائع ہوا جس میں انہوں نے دو نکات پر خاص طور سے بحث کی ہے، اولاً یہ ہے کہ قرآن نے کن لوگوں سے سُود "ربوا" لینا حرام کیا ہے؟ دوسرے یہ کہ کس مقدار میں سود لینا ممنوع ہے۔ پہلے نکتے پر ہمارے اور جناب یعقوب شاہ صاحب کے مضمونوں میں اشارہ موجود ہے، لیکن محترم پالوی صاحب نے اس کی پوری وضاحت کی ہے، بہرحال ان کے دونوں نکتے قابلِ غور ہیں۔

"ثقافت" نے اس مسئلے پر لکھنے کی عام دعوت دی تھی لیکن اس کی طرف توجہ اس لئے کم دی گئی کہ ہمارے علمائے فقہ علمِ اقتصادیات سے اور ماہرینِ اقتصادیات دینی فقہ سے اکثر ناواقف ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح بیشتر علمائے دین علمِ فرائض کے فہم سے عاری ہوتے ہیں۔

بہرکیف یہ چند مضامین ہم پھر قوم کے اہلِ علم کی توجہ کے لئے پیش کرتے ہیں۔ تاکہ وہ اس روشنی میں از سرِ نو مسئلے پر غور کریں۔ اور صحیح صورتِ حال کی طرف رہنمائی کریں۔ ہمارے خیالات حرفِ آخر نہیں۔ مگر یہ ضرور پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ ہماری نیت بخیر ہے۔ اور پیش کردہ مضامین اگلا قدم اُٹھانے میں روشنی کے مینار کا کام دے سکیں گے۔

ترتیب زمانی کے لحاظ سے ہمارے پہلے مضمون "سُود خواری کی قسمیں" کو پہلے آنا چاہیے

تھا، لیکن ہم نے اسے نمبر ۲ پر اس لئے رکھا ہے کہ ہمارے دوسرے مضمون "کمرشل انٹرسٹ کی دینی حیثیت" میں اس کے بعض حوالے موجود ہیں۔

سوال صرف یہ ہے کہ کمرشل انٹرسٹ جائز تجارتی بیع" ہے یا ناجائز "کاروبار ربوا" اسی کو ان مضامین میں حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کوشش میں ہم آپ سے بھی دستگیری کی توقع رکھتے ہیں۔

محمد جعفر پھلواروی

رفیق ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

فہرست

۱

سُود کے متعلّق چند سوالات

(از جناب سیّد یعقوب شاہ صاحب سابق جنرل آڈیٹر پاکستان)

مندرجۂ ذیل سطور کے تحریر کرنے پر مجھے جس چیز نے مجبور کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ میرا عمر بھر کا اثاثہ پراویڈنٹ فنڈ کی صورت میں تھا اور اُس میں ایک کثیر رقم سُود کی شامل تھی۔ مجھے ابھی تک اس کا تسلّی بخش جواب نہیں مل سکا کہ آیا یہ رقم میرے لئے جائز ہے یا ممنوع۔ جن علمائے کرام سے مَیں نے رجوع کیا ان میں سے اکثر نے اسے حرام کہا۔ لیکن ان میں سے دو نے جن کا مجھے بڑا احترام ہے۔ اس کو جائز قرار دیا۔ ایک صاحب نے لکھ کر اور دوسرے صاحب نے زبانی۔ اس لئے مَیں نے اس مسئلہ کے متعلق اردو اور انگریزی میں لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ لیکن جو کتابیں میری نظر سے گذریں۔ ان سے میری تشفی نہیں ہوئی کہ فیصلہ طلب امر یہ ہے کہ آیا ہر قسم کا سود جو آجکل رائج ہے "رِبوا" کے تحت آتا ہے اور اس لئے قرآنی احکام کے مطابق حرام ہے یا اس کی کچھ ایسی صورتیں بھی ہیں۔ جن پر "رِبوا" کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اور جن سے مسلمان بہرہ اندوز

ہو سکتے ہیں۔ باوجود کافی تگ و دو کے میں اس سوال کا تسلی بخش جواب دریافت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ موجودہ سعی بھی اسی زنجیر کی ایک کڑی ہے اس کوشش میں جو میرے ہاتھ آیا آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں اور آپ سے اور خاص کر علمائے کرام سے ہدایت کا طالب ہوں۔ تاکہ صحیح نتیجہ پر پہنچ سکوں۔

قرآن مجید میں "ربوا" کا ذکر ان چار مواقع پر آیا ہے:

(الف) سورۂ روم۔ وما اتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ

(ب) سورۂ نساء۔ واخذھم الربوا وقد نھوا عنہ واکلھم اموال الناس بالباطل۔

(ج) سورۂ آل عمران۔ یا ایھا الذین امنوا لاتاکلوا الربوا اضعافاً مضاعفۃ

(د) سورۂ بقرہ:۔ الذین یاکلون الربوا لایقومون الاکما یقوم الذی یتخبطہ الشیطن من المس۔ ذلک بانھم قالوا انما البیع مثل الربوا۔ واحل اللہ البیع وحرم الربوا، فمن جاءہٗ موعظۃ من ربہ فانتھی فلہ ما سلف وامرہ الی اللہ ومن عاد فاولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقات واللہ لایحب کل کفار اثیم۔ یا ایھا الذین امنوا

اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مؤمنین،
فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ،
ان تبتم فلکم رؤس اموالکم، لا تظلمون ولا
تظلمون۔

مولوی اصغر علی روحی فرماتے ہیں:۔

معتبر اور مقبول مفسرین نے پہلی آیت (سورۂ روم) کی تاویل ایسے معانی سے کی ہے جن کی رو سے وہ ہماری بحث میں داخل نہیں ہوسکتی۔ اس کی تاویل عطیہ سے کی ہے۔ جو لوگ آپس میں ایک دوسرے کو دیتے ہیں اور خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ معاوضہ ملے۔ یہ تفسیر ابن عباس، سعید بن جبیر، مجاہد، طاؤس، قتادہ اور ضحاک نے کی ہے۔ اور شیخ المفسرین طبری نے ان سے نقل کی ہے۔ نیز یہ آیت مکیہ ہے اور قرآن کا جو حصہ مکہ شریف میں نازل ہوا اس میں جزئی احکام نازل نہیں ہوئے بلکہ اس میں صرف توحید اور آخرت کا ذکر اور بڑے بڑے مکارم اخلاق کا بیان ہے تشریح جزئیات مدینہ منورہ کی آیات میں ہے جیسا کہ امام شاطبی نے موافقات میں ظاہر کیا ہے۔ سورۂ نساء والی آیت تاریخی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس قوم کا ذکر کیا ہے جس پر سود حرام کیا گیا تھا۔ مگر وہ سود سے باز نہ آئی۔ ..... سورۂ آل عمران اور سورۂ بقرہ دونوں کی آیتوں میں "ربوا" کا لفظ الف لام کے ساتھ ہے.....

اس لئے "الربوا" سے وہ "ربوا" مراد لیا جائے گا جو مخاطبین کے نزدیک معہود ہے یعنی جسے مخاطبین جانتے ہیں اور جو عام طور پر لوگوں میں متداول ہے۔ پس اس اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ لفظ "الربوا" سے وہ "ربوا" مراد ہے جو اہلِ عرب کے ہاں متداول تھا۔

مولانا مودودی صاحب نے لکھا ہے:

"قرآن جس زیادتی کو حرام قرار دیتا ہے وہ ایک خاص قسم کی زیادتی ہے۔ اس لئے اس کو "الربوا" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اہلِ عرب کی زبان میں اسلام سے پہلے بھی معاملہ کی اس خاص نوعیت کو اسی اصطلاحی نام سے یاد کیا جاتا تھا ...... چونکہ "الربوا" ایک خاص قسم کی زیادتی کا نام تھا۔ اور وہ معلوم و مشہور تھی۔ اس لئے قرآن مجید میں اس کی کوئی تشریح نہیں کی گئی۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

"ان اٰخر ما نزلت اٰیۃ الربوا وان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قبض ولم یفسرھا لنا، فدعوا الربوا والریبۃ۔"

لے معاشی الاسلام۔ جلد ثانی صفحہ ۳۶۔

گے سود حصہ اول صفحہ ۳۴، ۳۵۔

یعنی آیت "ربوا" قرآن مجید کی آخری آیات میں سے ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تشریح فرمانے سے پہلے رحلت فرما گئے۔ پس ربوا اور ریبہ (جس میں "ربوا" کا شائبہ ہو) دونوں کو چھوڑ دو۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے عیاں ہے کہ (۱) الربوا ایک خاص قسم کی زیادتی کا نام ہے۔ جس کی تشریح نہ قرآن مجید میں موجود ہے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ اور (ب) "الربوا" سے مراد وہ خاص قسم کی زیادتی ہے جو اس زمانہ میں عربوں میں اس نام سے معلوم و مشہور تھی۔ چنانچہ یہ لازم ہو جاتا ہے۔ کہ ہم یہ دریافت کریں، کہ عرب کس قسم کی زیادتی یا بڑھوتری کو "الربوا" کے اصطلاحی نام سے یاد کرتے تھے تاکہ اس کے متعلق غلطی کی وجہ سے ہم معصیت کے مرتکب نہ ہو جائیں۔ حلال و حرام کے معاملہ میں جہاں غیر ضروری آسانی پسندیدہ نہیں وہاں بے جا سختی بھی منع ہے۔ جہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ممنوع چیزوں کو جائز نہ ٹھہرایا جائے وہاں یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ جو چیز جائز ہے۔ اس کو ممنوع قرار نہ دیا جائے۔

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب فرماتے ہیں:-[1]

"قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری " اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا" یعنی ان لوگوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو رب بنالیا ہے تو حضرت عدی نے جو حاتم طائی کے فرزند اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے، آنحضرت

---

[1] سیرۃ النبی جلد چہارم صفحہ ۴۲۹

سے عرض کی کہ ہم پیشوایان مذہبی کو اپنا رب تو نہیں سمجھتے تھے، آپ نے فرمایا۔ کہ تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال اور جس کو چاہیں حرام کر دیں۔ عرض کی کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا۔ یہی رب بنانا ہے۔ عموماً اہلِ مذاہب پیغمبروں کو شارع مستقل سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے۔ شریعت کی تاسیس حلال وحرام کی تعیین، جائز و ناجائز کی تفریق، امر و نہی کے احکام یہ سب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔ پیغمبر صرف مبلغ اور پیغام رساں اور تعلیم الٰہی سے ان احکام کے شارح اور بیان کرنے والے ہیں۔ اِس بناء پر قرآن مجید میں ذاتِ نبوی کی صفتِ رسالت کو بار بار تاکیداً اور اصرار کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔" جہاں ہمارے بزرگانِ دین نے اپنے تقویٰ کے سبب یا سزا کی سختی کے پیشِ نظر سود کے معاملہ میں کبھی ڈھیل نہیں دی۔ وہاں انہوں نے اس کے معنی کی وسعت کے متعلق شاید اسی قدر احتیاط استعمال نہیں فرمائی اور "ربوا" اور "سود" کو متبادل الفاظ سمجھ لیا ہے۔ اِس طرح ممکن ہے ہم نے سود کی ایسی صورتیں حرام قرار دے دی ہوں۔ جن کا جاہلیت کے عربوں میں رواج نہ تھا جن پر اُن دنوں لفظ "ربوا" کا اطلاق نہ ہوتا تھا اور جن میں اُس زمانہ کی مروّجہ صورتوں کی خرابیاں بھی موجود نہیں ہیں۔ اگر ہم نے ایسا کیا ہے تو ہمیں سوچنا چاہیئے کہ کیا اس طرح ہم اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کر سکیں گے؟

گو صحاح میں کوئی ایسی حدیث نہیں ملتی جس میں "الربوا" کی تشریح کی گئی ہو۔ تاہم ایک ہی مطلب کی دو احادیث مروی ہیں:-

كل قرض جرّ منفعة فهو وجه من وجوه الربوا۔

(بیہقی) اور كل قرض جرّ به نفعاً فهو ربوا۔

(مسند حارث بن اسامہ)

یعنی ہر وہ قرض جس سے نفع اُٹھایا جائے "ربوا" ہے۔ لیکن اس کے اسناد ساقط ہیں[۱]۔ اِس لئے صحیح یہی ہے کہ یہ احادیث ثابت نہیں۔ نیز ان میں نفع کا بطور معاملہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا اور بطور شرط کے نفع رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم نے خود ادا فرمایا ہے۔ جیسا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

امام مالکؒ نے موطا میں زمانۂ جاہلیّت کے ربوا کی یہ شکل بتائی ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو کسی مدّت متعیّنہ پر کچھ قرض دیتا اور جب مدّت ختم ہو چکتی، تو قرض دہندہ[۲] قرض دار کو یوں کہتا۔ کہ یا تو قرض ادا کر دو۔ یا اس کی مقدار میں زیادتی کر دو۔ طبری[۳]۔ خازن[۴] بیہقی[۵]، سیوطی[۶]، خضری[۷]، سب جاہلیت کے "ربوا" کی کم وبیش یہی شکل بتاتے ہیں۔ مولانا مودودی صاحب[۸] لکھتے ہیں۔ "زمانۂ جاہلیت میں "الربوا" کا اطلاق جس طرح معاملہ پر ہوتا تھا۔ اس کی متعدد صورتیں روایات میں آئی ہیں۔ قتادہ کہتے ہیں۔ جاہلیّت کا ربوا"

---

[۱] سبل السلام شرح بلوغ المرام لان فی اسنادہ سوار بن مصعب الهمدانی المؤذن الاعمی وهو متروک[۲] وله شاهد ضعیف عن فضالة بن عبید عند البیهقی [۳] جامع البیان جلد چہارم صفحہ ۵۵ [۴] تفسیر جلد اوّل صفحہ ۲۴۳ [۵] السنن الکبریٰ الجزو الخامس ابواب الربوا [۶] الدر المنثور جلد اوّل صفحہ ۳۶۵ [۷] تاریخ التشریع مصر۔ [۸] سود حصّہ اوّل صفحہ ۳۵۔

یہ تھا۔ کہ ایک شخص ایک شخص کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرتا اور ادائے قیمت کے لئے ایک وقتِ مقررہ تک مہلت دیتا۔ اگر وہ مدت گزر جاتی اور قیمت ادا نہ ہوتی تو پھر وہ مزید مہلت دیتا اور قیمت میں اضافہ کر دیتا۔ مجاہد کہتے ہیں کہ جاہلیت کا "ربوا" یہ تھا۔ کہ ایک شخص کسی سے قرض لیتا اور کہتا اگر تو مجھے اتنی مہلت دے تو اتنا زیادہ دوں گا! ابوبکر جصاص کی تحقیق یہ ہے کہ اہلِ جاہلیت جب ایک دوسرے سے قرض لیتا تو باہم یہ طے ہو جاتا کہ اتنی مدت میں اتنی رقم اصل راس المال سے زیادہ ادا کی جائے گی! امام رازی کی تحقیق میں اہلِ جاہلیت کا یہ دستور تھا کہ وہ ایک شخص کو ایک معین مدت کے لئے روپیہ دیتے۔ اس سے ماہ بماہ ایک مقررہ رقم سود کے طور پہ وصول کرتے رہتے۔ جب وہ مدت ختم ہو جاتی تو مدیون سے راس المال کا مطالبہ کیا جاتا۔ اگر وہ ادا نہ کر سکتا تو پھر ایک مزید مدت کیلئے مہلت دی جاتی اور سود میں اضافہ کر دیا جاتا۔ کاروبار کی یہ صورتیں عرب میں رائج تھیں۔ یہی کو اہلِ عرب اپنی زبان میں "الربوا" کہتے تھے اور یہی وہ چیز تھی۔ جس کی تحریم کا حکم قرآن مجید میں نازل ہوا۔

یہ ظاہر ہے کہ احادیث صحیحہ اور دیگر متعدد روایات کے مطابق عرب جاہلیت میں "ربوا" کی جو صورت رائج تھی، وہ وہ تھی جو امام مالک نے بتائی ہے۔ جس کے متعلق قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ "ربوا" کا تعین اس وقت کیا جاتا ہے۔ جبکہ مقروض رقم معلوم[۱] دینے

۱ے مولانا ظفر احمد صاحب "رسالہ کشف الدجیٰ عن وجہ الربوا" میں لکھتے ہیں۔ "ہم کو مستفتی پر حیرت ہے کہ وہ قتادہ اور سعید بن جبیر اور امام شافعی اور ابن العربی اور واحدی وغیرہ مفسرین کی تفسیر سے بلاوجہ خوش ہوتا ہے حالانکہ

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۸ پر)

بلکہ عادی ہو چکا ہوتا تھا اور اس کی اس حالتِ اضطرار سے قرض دینے والا بے جا فائدہ اٹھا کر اپنی من مانی شرائط منوا سکتا تھا۔ یہ سود کی ایک خاص صورت تھی جو شاید عرب ہی میں رائج تھی۔ اور جس کے تحت مقروض کی حیثیت از حد کمزور ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ حضرات مجاہد اور ابوبکر جصاص نے ایک دوسری صورت بتائی ہے۔ جس میں مدت قرض اور شرح سود دونوں کا فیصلہ معاملہ کے شروع ہی میں ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ آج کل ہوتا ہے۔ تیسری صورت وہ ہے جس کا ذکر امام رازی نے فرمایا ہے۔ اگر دوسری اور تیسری صورتیں عام طور پر رائج ہوتیں تو غالب ہے کہ دوسرے اصحاب بھی ان کا ذکر کرتے۔ اس لئے گمان ہے کہ یا تو ان کا استعمال بہت کم ہوتا تھا۔ یا وہ ملک کے کسی خاص حصہ میں ہی رائج تھیں اور ان کا علم عرب میں عام نہ تھا۔ لیکن ہمارے نقطۂ نگاہ سے جو چیز خاص طور پر قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ خرید و فروخت سے متعلق جو مثال ملتی ہے وہ وہ ہے جو حضرت قتادہ نے بیان فرمائی ہے اور اس کا تعلق سود کی اس خاص صورت سے ہے۔ جس میں مقروض کی حیثیت بعید

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷) ان کی تفسیروں میں اس کے لئے خوشی کا کوئی موقع نہیں —— کیونکہ یہ حضرات بلکہ وہ تمام علماء جنہوں نے ربوا جاہلی کی تفسیر میں لفظ بیع کا ذکر کیا ہے اس امر پر متفق ہیں کہ اہلِ عرب بیع کے بعد جب مدتِ مقررہ پوری ہو جاتی ہے اس وقت کہتے تھے کہ تم رقم دو گے یا سود دو گے؟ اس پر اگر وہ رقم ادا نہ کرتا تو ثمن میں زیادتی کر دیتے اور خریدار کو مہلت دے دیتے۔

کمزور ہوتی ہے اور اس پر ظلم ہو سکتا ہے۔

باوجود کافی کوشش کے مَیں یہ معلوم نہیں کر سکا۔ کہ عرب جاہلیت میں "ربوا" کے اصطلاحی معنے کیا تھے۔ لیکن ان مثالوں سے جن کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ ہمارے علمائے کرام نے یہ استنباط کیا ہے[1] کہ راس المال پر جو زاید رقم مدت کے مقابلہ میں شرط اور تعین کے ساتھ لی جائے۔ وہ "ربوا" ہے۔ لیکن اگر اس وقت کے ان معاملات میں جن پر "ربوا" کا اطلاق ہوتا تھا۔ کوئی اور جزو مشترک بھی تھا۔ تو اس کو اور بھی عیاں کر دینا چاہیئے تھا۔ مثلاً اگر یہ سود ان معاملات تک محدود تھا۔ جن میں قرض کو نفع آور کاموں میں نہیں لگایا جاتا تھا۔ تو یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیئے تھی۔ ورنہ اس کے بغیر "ربوا" کی تعریف نامکمل رہ جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کوئی کہے۔ کہ گھوڑے کی ایک دُم، چار ٹانگیں، چار سُم، دو آنکھیں اور دو کان ہوتے ہیں۔ اس لیے جن مویشیوں میں یہ صفات ہوں۔ وہ گھوڑے ہیں۔ آپ فوراً کہہ دیں گے کہ یہ غلط ہے۔ کیونکہ گھوڑے کی سب ضروری صفات بیان نہیں ہوئیں۔

"ربوا" کی جو صورتیں اُوپر بیان کی گئی ہیں۔ اُن سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ جاہلیت کے عربوں میں تجارتی (PRODUCTIVE) سود کا رواج

---

[1] مولانا مودودی صاحب۔ سود حصّہ اوّل صفحہ ۳۲

تھا یعنی لوگ سُود پر قرض لے کر نفع آور کاموں کے لئے سرمایہ جمع کرتے تھے اسی طرح گورمنٹ اور امداد باہمی کی قسم کے قرضوں کا پتہ نہیں چلتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے قرض حاجت مندانہ اور صرفی EMERGENT AND CONSUMPTIONAL قسم کے ہی ہوتے تھے۔ ایک ایسے محترم بزرگ سے جن کی تحقیق اس معاملہ میں مسلّم ہے اور جو تجارتی سود کو بھی ممنوع قرار دیتے ہیں راقم نے درخواست کی تھی کہ زمانہ جاہلیت کے عرب میں تجارتی سود کے رواج کے متعلق اگر ان کے پاس کوئی اطلاع موجود ہو تو اس سے مستفیض فرمائیں۔ جواباً انہوں نے لکھا ہے "کہ یہ بات کسی کتاب میں صراحت سے تو نہیں لکھی گئی۔ کہ عرب جاہلیت میں تجارتی سود رائج تھا۔ لیکن اس امر کا ذکر ضرور ملتا ہے کہ عرب کے زراعت پیشہ لوگ یہودی سرمایہ داروں سے سود پر قرض لیا کرتے تھے اور خود یہودیوں میں باہم بھی سودی لین دین ہوتا تھا۔ نیز قریش کے لوگ جو زیادہ تر تجارت پیشہ تھے باہم سود پر قرض لیتے دیتے۔ قرض کی ضرورت لازماً نادار آدمیوں کو اپنی ذاتی ضروریات پوری کرنے کے لئے پیش نہیں آتی بلکہ زراعت پیشہ افراد کو زرعی کاموں کے لئے اور سوداگروں کو اپنے کاروبار کے لئے بھی پیش آتی ہے اور یہ آج کوئی نئی صورت نہیں ہے۔ بلکہ قدیم سے چلی آرہی ہے۔"

مَیں باادب عرض کروں گا کہ اس وقت کے زراعت پیشہ لوگوں کے قرض "تجارتی"

قرض تصور نہ ہونے چاہئیں۔ اس قسم کے قرض نادار اور حاجت مند لوگ لیا کرتے تھے، ان کے قرض مجبوری کے قرض ہوا کرتے تھے اور ضروریات زندگی پوری کرنے کی غرض سے لئے جاتے تھے، جیسا کہ ہمارے اپنے ملک میں رواج تھا۔ ایسے قرضوں کو ماہران معاشیات بھی نفع آور PRODUCTIVE نہیں سمجھتے۔ وہ لکھتے ہیں: "حاجت مندانہ یا صرفی قرض کی طرح زرعی قرض بھی منصب و ظلم کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ انہی برائیوں کے خلاف عہد نامۂ قدیم کے نبیوں اور یونانی فلاسفروں نے اپنی آوازیں اٹھائیں اور رومی قانون سازوں نے کوشش کی کہ کم از کم شرح سود کی حد مقرر ہو جائے۔"

یہودیوں کے باہم لین دین سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے قرض نفع آور کاموں کے لئے ہوتے تھے۔ عرب کے یہود اکثر زراعت پیشہ تھے۔ اور ایسے لوگوں کے قرض تجارتی قرض نہیں کہلا سکتے۔ ممکن ہے یہ لوگ ساہوکارہ بھی کرتے ہوں۔ لیکن موقع کے فقدان کی وجہ سے یورپ کے اکثر حصہ کی طرح یہاں بھی ان کے قرض غریب اور امیر دونوں قسم کے حاجت مندوں کو ان کی نجی ضروریات کے لئے دئے جاتے ہوں گے۔ بہر حال ان کے ہاں بھی تجارتی سود کی کوئی مثال منقول نہیں۔

باقی رہے قریش کے باہم قرضے، ان کی جو مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں تجارتی قرض کی کوئی مثال شامل نہیں۔ ان دونوں تجارت نجی سرمایہ یا شراکت یا مضاربت سے

ہوتی تھی۔ عرب تاجر بے تنک دور دراز ملکوں تک جاتے تھے اور بڑے بڑے جتھے باندھ کر سفر کرتے تھے۔ قرآن مجید میں بھی رحلۃ الشتاء والصیف کا ذکر آیا ہے۔ مگر یہ اجتماعی شکل صرف راستہ کے خطرات سے محفوظ رہنے کے لئے تھی، ورنہ سرمایہ اور سامان مہیا کرنے میں ہر شخص اپنی ذات کا ذمہ دار تھا۔ جب مکّہ سے قافلہ چلتا تو سب حصّہ دار اپنا اپنا مال لے آتے۔ جسے دوسرے علاقہ میں لے جا کر فروخت کر دیا جاتا۔ اور اس کے بدلے وہاں سے چیزیں خرید کر واپسی پر راستہ میں یا مکّہ پہنچ کر فروخت کر دی جاتیں۔ اور اس طرح جو منافع ہوتا وہ شریک کار بانٹ لیتے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تجارت کے لئے سود پر سرمایہ اکٹھا کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ حضرت عثمان رض بن عفان اور حضرت عباس رض بن مطلب رضی اللہ عنہما دونوں قریش میں سے تھے، اور روپیہ سُود پر دیا کرتے تھے۔ لیکن کن کو؟ کھجور کی کاشت کرنے والوں کو۔ منقول ہے کہ جب کھجوریں اکٹھی کرنے کا وقت آتا تھا تو کاشتکار عرض کرتا تھا کہ قرض خواہ فصل میں سے صرف نصف لینا منظور کرے اور باقی نصف مقروض اور اُس کے بال بچوں کے لئے چھوڑ دے تو مقروض آئندہ سال دُگنی مقدار کھجوروں کی ادا کرے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قریش کے قرض بھی زرعی اور حاجت مندانہ قسم کے ہی

تھے اور تجارتی نہ تھے۔

آج کل کے زمانہ میں ہم تجارتی قرض سے اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ ہمارے ذہنوں میں یہ آ ہی نہیں سکتا کہ کسی وقت دنیا کا کوئی حصہ ایسے قرضوں سے خالی رہا ہو گا۔ لیکن یہ تاریخی امر ہے کہ یورپ کے بیشتر حصہ میں پانچویں اور دسویں صدی عیسوی کے درمیان تجارتی سود موجود نہ تھا۔ ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب[14] نے لارنس ڈینس سے نقل کیا ہے "یہ جو عام خیال ہے کہ قرض شروع میں تجارت کی امداد کے لئے ترقی پذیر ہوا تھا۔ غلط ہے۔ وینشین۔ ڈچ۔ ہنزٹیک۔ برٹش۔ اور دوسرے تاجر سترھویں صدی تک روپیہ دینے والوں کو اپنا شریک بنا کر سرمایہ حاصل کرتے تھے۔ ایشلے[15] لکھتا ہے۔ "آج کل کے مستند نقاد اس سے انکار نہیں کرتے کہ ازمنہ وسطےٰ میں ایک دور آیا۔ جس میں دولت کو منفعت بخش

14- Islam and the theory of Interest P 197

15- An Introduction to English Economic History and theory. Part 1, Middle Ages Ashley.

کاموں میں لگانے کے مواقع کی اس قدر کمی تھی کہ سُود دینے کے برخلاف جو سخت رجحان تھا وہ جائز تھا۔ ان نقادوں میں اگر کوئی اختلاف ہے تو صرف اس امر میں ہے کہ یہ دَور کب ختم ہوا؟

مندرجہ بالا حقائق سے ظاہر ہے (۱) کئی ملکوں میں پانچویں اور دسویں صدی عیسوی کے درمیان (جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا زمانہ شامل ہے) تجارتی سود مفقود تھا اور (۲) عرب کے طریقۂ تجارت کے پیش نظر ممکن ہے کہ اس ملک میں اس وقت تک تجارتی سود کا رواج ہی نہ ہوا ہو۔ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہمارے مؤرخوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے حالات کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ باوجود اس کے جب انہوں نے تجارتی سُود کا ذکر نہیں کیا اور سودی معاملات کے تذکرہ میں اس کی ایک مثال بھی نہیں دی تو گمان غالب یہی ہونا چاہیئے کہ اس کا وجود ان دنوں میں نہیں تھا۔ اگر یہ درست ہے کہ عرب جاہلیت میں نفع آور کاموں کے لیے سود پر قرض نہیں لئے جاتے تھے اور "ربوا" کا اطلاق سُود کی جن صورتوں پر ہوتا تھا۔ ان کا تعلق حاجتمندانہ یا صرفی قرضوں سے ہی ہوتا تھا۔ تو پیراگراف (۱۰) میں "ربوا" کی جو تعریف بیان کی گئی ہے اُس کو بدلنا پڑے گا۔

اب تک یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس بات کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں کہ جاہلیت کے عرب نفع آور کاموں کے لئے بھی سود پر قرض لیتے تھے

اس لیے جس بڑھوتری کو وہ "الربوا" کہتے تھے اس کا تعلق حاجتمندانہ اور صرفی قرضوں تک ہی محدود ہوگا۔ اور اب بھی اسی طرح ہی محدود رہنا چاہیئے۔ اب اس نظریہ کی تائید میں چند عقلی دلائل پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ حدیثوں کی تدوین کے متعلق محدثین نے درایت کے اصول منضبط کئے ہیں۔ ابنِ جوزیؒ لکھتے ہیں کہ وہ حدیث جس میں ذرا سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو یا معمولی کام پر بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہو قابلِ اعتبار نہیں۔ قرآنِ کریم نے جس قدر سزا سود کے کھانے والے کے لئے رکھی ہے وہ شاید کسی اور مجرم کے لیے تجویز نہیں فرمائی۔ اس جرم کی اہمیت اور گھناؤنے پن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کسی صاحبِ عقل کو اس سے انکار نہ ہوگا کہ ایک حاجتمند سے جس کو ضروریاتِ زندگی کے لئے قرض لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ سود لینا شقاوتِ قلبی ہے۔ اور اس کی مناہی سختی سے ہونی چاہیئے۔ لیکن تجارتی سود پر یہ الزام وارد نہیں ہوتا۔ اس کے لینے والے مفلس و نادار نہیں ہوتے۔ وہ قرض نفع کمانے کی غرض سے لیتے ہیں اور عام طور پر نفع شرح سود سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے سود پر دو اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسی آمدنی محنت کو چھوڑنے اور آرام طلب ہونے کی ترغیب دیتی ہے۔ لیکن یہ اعتراض ان لوگوں

۱؎ فتح المغیث مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۱۱۲ و سیرۃ النبیؐ جلد اول از علامہ شبلی نعمانی صفحہ ۳۹۔

پر عائد ہونا چاہیئے۔ جن کے پاس بڑی زمینداری ہے۔ یا بہت سے مکان ہیں۔ یا کمپنیوں کے بے شمار حصے ہیں اور وہ ان کی آمدنیوں پر بن محنت گزر اوقات ہی نہیں بلکہ عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر اسلام اِن نکھٹوؤں کی آمدنی کو حرام قرار نہیں دیتا تو تجارتی سُود لینے والا ہی کیوں موردِ عتاب ہو؟ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ سود دے کر تجارت کرنے والے کو چاہے نقصان ہو مگر سود لینے والے کو منافع ہی ملے گا۔ یہ اعتراض کسی حد تک درست ہے۔ قرض لینے والا اگر دیوالیہ ہو جائے تو ممکن ہے قرض دینے والے کو اپنا راس المال بھی پورا واپس نہ ملے گا، مگر اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ تجارت کے لئے روپیہ سود پر اس لئے لیا جاتا ہے کہ قرض لینے والے کو شرح سُود سے کئی گنا زیادہ نفع کی امید ہوتی ہے اور اکثر یہ پوری ہو جاتی ہے ورنہ تجارتی سُود کو اس قدر فروغ حاصل نہ ہو۔ ایسے قرض دینے والے کو ایک چھوٹی رقم مقررہ اوقات پر ملتی رہتی ہے۔ اور اس کے مقابل قرض لینے والا اکثر اس رقم سے کئی گنا زیادہ فائدہ کما لیتا ہے اور کبھی اس کو نقصان بھی ہوتا ہے۔ اس قسم کے خطرے کو قبول کرنا تجارت کا عام مسلک ہے۔ اور یہ ایسی چیز نہیں اور اس سے ایسی خرابیاں پیدا نہیں ہوتیں۔ کہ فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ کی سزا کا مستحق ہو۔ اس لئے میرے خیال ناقص میں سب ایسی احادیث اور روایات کا جو تجارتی سود کو ربٰوا کے تحت لائیں، سختی سے تجزیہ ہونا چاہیئے اور ان کو ہمیں اس کے بغیر مان نہیں

لینا چاہیئے۔

اسلام کو ہمیشہ سے اس بات پر بجا فخر رہا ہے کہ اس کے احکام عقل کی کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی[له] صاحب فرماتے ہیں۔ "خُدا کا وجود، توحید رسالت، قیامت، جزا اور سزا عبادت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اخلاق وغیرہ ہر تعلیم کی تلقین کرتے وقت اس نے اس کی صداقت کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں" تحریم "ربوا" کا تعلق عبادات سے بھی نہیں بلکہ معاشی معاملات سے ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے متعلق احکام کی تعبیر کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ہی چند اصول بیان فرمائے ہیں۔ مثلاً فرمایا ہے:۔

"یسئلونک عن الخمر والمیسر، قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس واثمھما من اکبر من نفعھما"

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے اس آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے "اے پیغمبر تم سے لوگ شراب اور جوئے کی بابت دریافت کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو۔ ان دونوں چیزوں میں نقصان بہت ہے۔ اور انسان کے لئے فائدے بھی ہیں لیکن اِن کا نقصان ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے (پس ان سے احتراز کرو)"

له سیرۃ النبی جلد چہارم صفحہ ۳۵۹

اس کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں۔ "عام طور پر سمجھا جاتا ہے اور اب تک سمجھا جاتا ہے، کہ شراب سے لڑائی لڑنے میں مدد ملتی ہے، اور جوا حصول مال کا ذریعہ ہے۔ اس غلطی کا ازالہ کر دیا گیا اور یہ اصولی حقیقت بتلا دی گئی کہ صرف اشیاء کا نفع ہی نہیں دیکھنا چاہیئے۔ کیونکہ اضافی نفع سے تو کوئی بھی چیز خالی نہیں۔ بلکہ نفع اور نقصان دونوں کا توازن کرنا چاہیئے۔ جس چیز میں نقصان زیادہ ہو اُسے ترک کر دینا چاہیئے، اگرچہ تھوڑا بہت نفع بھی ہو۔ اور جس چیز میں نفع زیادہ ہو اُسے اختیار کرنا چاہیئے۔ اگرچہ نقصان کا بھی احتمال ہو۔"

مولانا مودودی صاحب نے حسب ذیل ترجمہ کیا ہے:۔

"پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ کہو ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں لوگوں کے لئے کچھ منافع بھی ہیں۔ مگر ان کا نقصان ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔" مولانا موصوف رسالہ دینیات کے صفحہ ۱۲۱ پر فرماتے ہیں۔ "پھر جن کاموں میں ایک پہلو فائدے کا اور دوسرا نقصان کا ہو ان میں شریعت کا اصول یہ ہے کہ بڑے فائدے کے لئے چھوٹے نقصان کو قبول کیا جائے۔ اور بڑے نقصان سے بچنے کے لئے چھوٹے فائدے کو چھوڑ دیا جائے۔" اس اصول کے ماتحت تجارتی سود کو پرکھیئے۔ اس کا نفع اس کے نقصان سے بدرجہا زیادہ ہے۔ پھر ایسے سود کے لینے والوں کو کیوں اصحاب النار سمجھا جائے اور ان سے "حرب من اللہ و رسولہ" کی ضرورت کیوں ہو۔ مضطر اور کمزور حاجتمند

کو قرض دینے والے کو شاید اپنا فائدہ اِسی میں دکھائی دے کہ مقروض ادا کرنے کے قابل نہ رہے اور وہ اس کی جائداد پر قبضہ کر لے۔ کیونکہ بینکس پر وار کرنا آسان ہے۔ لیکن بنک جب کمپنیوں اور تاجروں کو قرض دیتے ہیں تو وہ ان کی پامالی کے منتظر نہیں رہتے بلکہ ان کی خوش حالی چاہتے ہیں کیونکہ ان کی اپنی ترقی اسی سے وابستہ ہوتی ہے۔

میں بادب عرض کروں گا کہ یہ عمل قابلِ غور ہے۔ کہ مندرجۂ بالا قرآنی اصول کے ہوتے ہوئے ہم اس میں کہاں تک حق بجانب ہیں کہ تجارتی (PRODUCTIVE) سود کو بھی احکام تحریم "ربوا" کے تحت لے آئیں۔

بعض اصحاب نے آیت متذکرہ بالا میں "اثم" کا ترجمہ نقصان کرنے پر اعتراض کیا ہے۔ مولانا مودودی صاحب سے اس کی بابت استفسار کیا۔ تو آپ نے فرمایا: "میں نے "اثم" کا ترجمہ نفع کے تقابل کی وجہ سے گناہ کی بجائے نقصان کیا ہے۔ ویسے یہ زبان کے اعتبار سے غلط بھی نہیں ہے۔ کیونکہ "اثم" کے اصل معنی خیر مطلوب کو پہنچنے میں قاصر رہ جاتے کے ہیں۔ اسی معنے کے لحاظ سے عرب کہتے ہیں "اثمت الناقۃ" یعنی اونٹنی سست رفتار ہے۔ جو تیز رفتاری اس میں مطلوب ہے اس سے کوتاہی برتتی ہے۔"

"ربوا الفضل" کے متعلق جو احادیث ہیں۔ ان سے بعض علمائے کرام تجارتی سود کی حرمت پر استدلال کرتے ہیں۔ اس لئے اب آپ کی توجہ ان کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے۔ ربوا الفضل" اس زیادتی کو کہتے ہیں جو ایک ہی قسم کی چیزوں کے دست بدست لین دین میں ہو۔ متعدد احادیث کی بنا پر فقہاء نے فیصلہ کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ پیشتر عرض کیا جا چکا ہے کہ تحریم" ربوا" کی آیت آخری آیات قرآنی میں سے ہے۔ یہ نویں ہجری میں نازل ہوئی اور سنہ ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اعلان فرمایا۔ "ربوا الفضل" کے احکام اس سے پہلے کے ہیں۔ مولانا مودودی فرماتے ہیں " سنہ ۵۲ھ میں جنگِ اُحد کے بعد پہلا قدم شرح سود کی تخفیف کے بارے میں اُٹھایا گیا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلہ اور اجناس کے کاروبار میں سٹہ (SPECULATION) کو روکا اور ایک ہی جنس کی چیزوں کے مبادلہ میں کمی اور بیشی کو سود قرار دیا۔ اس کے بعد آپؐ نے صرافہ (EXCHANGE) کی طرف توجہ فرمائی۔ اور سونے چاندی بصورتِ جنس (BULLION) یا بصورتِ زر (MONEY) دونوں کے مبادلہ میں ناجائز نفع بازی کا دروازہ بند کر دیا۔ آخری ضرب اور فیصلہ کن ضرب فتح مکہ کے بعد لگائی گئی۔" سید سلیمان صاحب ندوی فرماتے ہیں" سب سے پہلے آپؐ نے

چاندی اور سونے کے اُدھار خرید و فروخت کو سُود قرار دیا۔ پھر دوگنے اور چوگنے سُود لینے کی ممانعت آئی۔ اس کے بعد آپؐ نے ہم جنس اشیاء کا گھٹ بڑھ کے مبادلہ سے منع فرمایا۔ ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے موقع پر مسلمانوں نے یہودی سوداگروں سے لین دین شروع کر دیا۔ اس وقت آپؐ نے اعلان فرمایا کہ سونے کو اشرفی کے بھاؤ گھٹا بڑھا کے بیچنا سُود ہے۔" ان تشریحات سے ظاہر ہے کہ "ربوا لفضل" کے احکام سورۂ بقرہ کی آیات تحریم "ربوا" کے نزول سے پہلے کے ہیں۔ اس لئے اس وقت کسی قسم کی بڑھوتری کو "ربوا" کہنے سے اُس کی ممانعت مقصود نہیں ہو سکتی تھی۔ اس وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایسی بڑھوتری اور مبادلہ کے متعلق شاید لفظ "ربوا" استعمال نہ فرمایا ہو تب بھی اغلب تو یہی ہے کہ اس سے مراد اصطلاحی "ربوا" جو بعد میں حرام قرار دیا گیا نہ ہوگا بلکہ جیسا سر سید احمد خاں نے لکھا ہے "ربوا" کا لفظ بیع فاسد کے معنی میں استعمال کیا گیا ہو گا۔

ربوا لفضل کے موضوع پر جو متعدد احادیث موجود ہیں۔ اُن میں سے چند یہاں نقل کی جاتی ہیں:۔

(۱) عن ابی سعید ن الخدری قال	ابو سعید خدری کہتے ہیں۔ کہ نبی صلے اللہ
قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم	علیہ وسلّم نے فرمایا۔ سونے کا مبادلہ سونے

الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل يداً بيدٍ فمن زاد او استزاد فقد اربى، الآخذ والمعطي فيه سواء۔

(البخاری واحمد ومسلم)

(ب) عن ابی سعید وابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم استعمل رجلاً علی خیبر، فجاءه بتمر جنیب فقال اکل تمر خیبر هکذا قال لا والله یا رسول الله انا لنأخذ الصاع من هذا بصاعین والصاعین بالثلاث فقال لا تفعل بع الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنیبا وقال فی المیزان مثل ذلک۔

(البخاری ومسلم)

سے، چاندی کا چاندی سے، گیہوں کا گیہوں سے، جَو کا جَو سے، کھجور کا کھجور سے، نمک کا نمک سے، جیسے کا تیسا اور دست بدست ہونا چاہیے۔ جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا اُس نے سودی معاملہ کیا۔ لینے والا اور دینے والا دونوں گناہ میں برابر ہیں

ابو سعید اور ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو خیبر کا تحصیلدار مقرر کر کے بھیجا۔ وہاں سے (مالگذاری میں) عمدہ قسم کی کھجوریں لیکر آیا۔ آنحضرتؐ نے پوچھا، کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ اس نے کہا نہیں یا رسولؐ ہم جو ملی جلی کھجوریں وصول کرتے ہیں انہیں کبھی دو صاع کے بدلے ایک صاع کے حساب سے اور کبھی تین صاع کے بدلے دو صاع حساب سے ان اچھی کھجوروں سے بدل لیتے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو۔ پہلے ان مخلوط کھجوروں کو درہموں کے عوض فروخت

کردو۔ پھر اچھی قسم کی کھجوریں درہموں کے عوض خرید لو۔ یہی بات آپؐ نے وزن کے حساب سے مبادلہ کرنے کی صورت میں بھی ارشاد فرمائی۔

(ج) عن ابی سعید ن الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تبیعوا الذھب بالذھب الا مثلاً بمثل ولا تشفوا بعضھا علی بعض ولا تبیعوا الورق بالورق الا مثل بمثل ولا تشفوا بعضھا علی بعض ولا تبیعوا منھا غائباً بناجز۔

ابوسعید خدری کہتے ہیں۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سونے کو سونے کے عوض نہ بیچو۔ مگر جوں کا توں۔ کوئی کسی کو زیادہ نہ دے۔ اور چاندی کو چاندی کے عوض نہ بیچو۔ مگر جوں کا توں۔ کوئی کسی کو زیادہ نہ دے۔ اور نہ غائب کا تبادلہ حاضر سے کرو۔

(بخاری و مسلم)

یہ ظاہر ہے کہ ایک ہی جنس کی دو چیزوں کو بدلنے کی ضرورت صرف اس صورت میں پیش آتی ہے جبکہ اتحاد جنس کے باوجود ان کی نوعیتیں مختلف ہوں۔ مثلاً چاول اور گیہوں کی ایک اور دوسری قسم عمدہ سونا اور گھٹیا سونا یا معدنی نمک اور سمندری نمک وغیرہ۔ ہمارے علمائے کرام کا کہنا ہے کہ ہم جنس اشیاء کے کمی بیشی[1] کے ساتھ مبادلہ کرنے سے اس ذہنیت کے پرورش پانے کا اندیشہ

[1] مولانا مودودی صاحب سود حصہ اول صفحہ ۷۸

ہے جو بالآخر سود خواری اور ناجائز نفع اندوزی تک جا پہنچتی ہے۔ لیکن آپ ذرا غور سے سوچیں کہ اگر ایک ہی جنس کی اعلیٰ اور ادنیٰ قسم برابر ہی بدلی جا سکے۔ تو کیا اس کا نتیجہ یہ نہ ہو گا کہ طاقتور لوگ اپنی ادنیٰ چیز کے بدلے کمزور لوگوں کو اپنی اعلیٰ چیز دینے پر مجبور کرنے کے کوشاں رہیں گے؟ جس سے غصب کی ذہنیت پرورش پائے گی۔ اور یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مولانا مودودی آگے چل کر فرماتے ہیں۔ "اس لئے شریعت نے قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ ہم جنس اشیاء کے مبادلہ کی اگر ضرورت پیش آئے تو لازماً حسب ذیل دو شکلوں میں سے ہی کوئی ایک شکل اختیار کرنی ہو گی۔ ایک یہ کہ ان کے درمیان قدر و قیمت کا جو تھوڑا سا فرق ہو اُسے نظر انداز کر کے برابر مبادلہ کر لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ چیز کا چیز سے براہِ راست مبادلہ کرنے کی بجائے ایک شخص اپنی چیز روپے کے عوض بازار کے بھاؤ بیچ دے اور دوسرے شخص سے اس کی چیز روپے کے عوض بازار کے بھاؤ خرید لے"۔ کوئی شخص اپنی چیز بہتر دوسرے کی کمتر چیز مگر ہم جنس سے برابر بدلنے پر خوشی سے رضا مند نہیں ہو گا۔ اس لئے اس کو ترغیب ہو گی کہ دوسرا طریقہ اختیار کرے یعنی اپنی چیز کو روپے کے عوض بیچ دے اور اس روپے سے دوسری چیز خرید لے۔ میں یہ رائے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی منشاء تھا۔ جیسا کہ منقولہ بالا احادیث میں سے نمبر (ب) سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ اس لئے کہ تبادلہ جنسی (BARTER ECONOMY) کی بجائے سکہ

سے خرید و فروخت (MONEY ECONOMY) رواج پا جائے۔ اور ایک مسلّمہ امر ہے کہ دنیا کی معاشی ترقی میں یہ ایک اہم اور ضروری قدم تھا۔ جس کے اُٹھانے کی ترغیب شارح اسلام صلّی اللہ علیہ وسلم ہر پسماندہ قوم کو دینا چاہتے تھے۔ اگر یہ نظریہ درست ہے تو ربوا الفضل کا آیات تحریم "ربوا" سے کوئی تعلق نہیں۔ اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنا چاہیئے۔

اگر تاریخ اور احادیث کی بنا پر تجارتی یا نفع آور قرض کے سود کو "ربوا" کے تحت لانے کے لئے کوئی بیّن وجوہ موجود نہیں اور اگر عقلی دلائل کی بنا پر ایسے سود کو "ربوا" کی حدود سے باہر رکھنا چاہیئے تو فقہ کے اس متفقہ فیصلہ پر کہ اگر منفعت کی غرض سے کوئی قرض دیا جائے تو اس کا منافع "ربوا" کہلائے گا نظر ثانی ہونی چاہیئے۔ لیکن اس کے کیا امکان ہیں۔ مولانا مودودی صاحب[۵] فرماتے ہیں۔

فقہائے کرام نے اس دور میں احکام شریعت کی جو تعبیر کی تھی۔ وہ معاملات کی ان صورتوں کے لئے تھی جو ان کے گرد و پیش کی دنیا میں پائی جاتی تھیں۔ مگر اب ان میں سے اکثر صورتیں باقی نہیں رہی ہیں۔ اور بہت سی دوسری صورتیں ایسی پیدا ہو گئی ہیں جو اُس وقت موجود نہ تھیں۔ اس لئے بیع و شرا اور مالیات و معاشیات کے متعلق جو قوانین ہماری فقہ کی قدیم کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔

---

[۵] سود حصّہ اوّل صفحہ ۵۳

ان میں سے اکثر کی اب حاجت نہیں رہی۔ اور جن قوانین کی اب حاجت ہے وہ ان میں موجود نہیں ہیں۔ پس اختلاف اس امر میں نہیں ہے کہ معاشی اور مالی معاملات کے لئے قانون اسلامی کی تدوین جدید ہونی چاہیئے یا نہیں بلکہ اس امر میں ہے کہ تدوین کس طرز پر ہو۔" جیسا کہ اُوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کو تجارتی سرمایہ اکٹھا کرنے کے لئے سود پر قرض لینے کی ضرورت نہ پڑتی تھی یہ حالات اسلام کے تیسری دَور میں بھی قائم رہے اور ہمارے فقہائے کرام نے جب متذکرہ بالا فیصلہ دیا۔ اس وقت گو بڑے بڑے تاجر موجود تھے۔ تاہم اس دُور کی تجارت کا طریقہ ہی ایسا تھا کہ سرمایہ حاصل کرنے کے لئے سودی قرض کی ضرورت نہ پڑتی تھی اور تجارتی دوڑ میں دوسری قوموں سے مقابلہ کرنے کے لئے بڑے بڑے سرمائے ایک جگہ اکٹھے کرنے لازم نہ تھے۔ اِس لئے ان کو تجارتی سُود کے بارے میں کوئی خاص غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں واسکوڈی گاما نے ہندوستان کا اور کولمبس نے امریکہ کا بحری راستہ دریافت کیا۔ جس سے تجارت کو فروغ ہوُا۔ پھر صنعتی بحران کا زمانہ آیا۔ اور بڑی بڑی مشترکہ سرمایہ کی کمپنیاں بننے لگیں۔ جن کے لئے سود پر سرمایہ حاصل کرنا لازم ہو گیا۔ جب یہ بڑے کاروبار کا زمانہ آیا تو اس سے پہلے ہی ہمارے علماء اپنے اُوپر اجتہاد کا دروازہ بند کر چکے تھے اور ان تبدیل شدہ اور نئے حالات کے تحت مسئلۂ سود پر آزادانہ طور پر غور خوض نہیں کیا گیا اور جو کچھ تحقیق بھی کی گئی۔ وہ

فقہائے قدیم کے فیصلوں کے زیرِ اثر ہی کی گئی۔ مولانا مودودیؒ صاحب کے نزدیک اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری دینی تعلیم سے قرآن اور سیرتِ محمدیؐ کا مطالعہ خارج ہو گیا ہے اور اس کی جگہ محض فقہ کی کسی ایک سسٹم کی تعلیم نے لے لی ہے۔ ہماری دینی تعلیم کی جس کمی کی طرف مولانا صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن یہ بھی قابلِ غور ہے کہ جب سے اجتہاد کا دروازہ بند ہوا ہے اُس وقت سے لے کر آج تک دُنیا کے علم میں کسی قدر اضافہ ہو گیا ہے۔ مذہبی، تاریخی، تنقیدی معلومات اور سیرۃ نبویؐ پر ڈھیروں مستند کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور کسی امر کی تحقیق کے لئے پہلے زمانہ میں جو مواد موجود تھا۔ اس سے آج کئی گنا زیادہ مواد موجود ہے۔ نیز رسل و رسائل کی ترقی کی وجہ سے یہ امداد کسی خاص ملک تک محدود نہیں رہی بلکہ بین الاقوامی پیمانہ پر موجود ہے اِس لئے میری ناقص رائے میں اجتہاد کا دروازہ بند کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے اور یہ ذمہ داری ہمارے علمائے کرام پر عائد ہوتی ہے کہ وہ آجکل کے تبدیل شدہ حالات کے لئے شریعت کے اصولوں سے نئے احکام نکالیں یا پہلے احکاموں میں مناسب ترمیم فرمائیں۔

صنعتی اور معاشی حالات کی تبدیلی کی وجہ دائن اور مدیون کے تعلقات میں دو طریقوں سے نمایاں فرق آ گیا ہے۔ ایک یہ کہ پہلے زمانہ میں پیشہ ور مہاجن حاجتمند یا فضول خرچ لوگوں کو قرض دیتے تھے اور ان کی ناداری و بیوقوفی

سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ آج کل عامتہ الناس اپنی آمدنی میں سے تھوڑا بہت پس انداز کر کے گورنمنٹ کو یا بڑی بڑی کمپنیوں کو بذاتِ خود یا بنکوں کی معرفت قرض دیتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ پہلے زمانہ میں قرض خواہ مقروض کی کمزوری کی وجہ سے مقروض کے سر چڑھا رہتا تھا۔ لیکن آج کل قرض لینے والے بڑے بڑے تاجر، کمپنیاں، سلطنتیں یا ادارے ہوتے ہیں۔ اور ان پر قرض خواہ کسی طرح ظلم نہیں کر سکتا۔ حاجتمند اور صرفی قرضوں کی حدود سے باہر دائن اور مدیوں کے تعلقات میں یہ جو فرق آگیا ہے اس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ جو فتاوی اِس تغیر سے پہلے کے ہیں، اور جن میں اس تبدیلی کو زیر غور نہیں لایا گیا۔ میرے خیال ناقص میں وہ ناطق نہ ہونے چاہئیں۔

آج کل صنعت اور تجارت اس قدر بڑے پیمانہ پر ہوتی ہے کہ اس کے لئے ضروری سرمایہ کا اہتمام ایک دو بلکہ سو پچاس آدمیوں کے بس کا بھی نہیں۔ اور اس کی صورت جو موجودہ تمدن نے پیدا کی ہے یہ ہے کہ ملک کے چھوٹے چھوٹے اور بڑے بڑے سرمائے چند مرکزوں پر جمع ہو جاتے ہیں جن کو بنک کہتے ہیں۔ بنک اس جمع شدہ سرمایہ کی بنا پر تاجروں وغیرہ کو جاریہ شرح سود پر قرض دیتے ہیں۔ اس طرح صنعت اور تجارت کے لئے حسبِ ضرورت بڑے سرمائے مہیا ہو جاتے ہیں۔ اور بڑے پیمانہ پر اشیا مہیا کی جاتی ہیں جو سود کا بار برداشت کرنے کے باوجود انفرادی کوششوں سے پیدا کی ہوئی اشیاء کی نسبت

سستی پڑتی ہیں اور اپنے مالکوں کو بے شمار نفع بخشتی ہیں۔ جو قوم تجارت کے اس طریقہ کار پر رضامند نہیں ہوتی وہ بڑے پیمانہ پر صنعت اور تجارت نہیں کر سکتی اور معاشی دوڑ میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ جاتی ہے۔ ایسی قوم کی سالمیت ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے۔ اور بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ معاشی لحاظ سے کمزور قوموں کو اپنی ضروریات زندگی کے لئے دوسروں کا اس حد تک دستِ نگر ہونا پڑتا ہے۔ کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی ان کے معاشی نظام میں دخل حاصل کر کے بالآخر ان پر پوری طرح چھا جاتا ہے نیز آلاتِ حرب اس زمانہ میں اس قدر قیمتی ہو گئے ہیں کہ جو قوم معاشی کمزوری میں مبتلا ہے وہ اپنے دفاع کا مناسب انتظام نہیں کر سکتی۔ اِس لئے ہر اسلامی ملک کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے معاشی نظام کو قوی سے قوی تر بنائے۔ اس کے لئے نہ صرف ملکی بلکہ اس سے زیادہ بین الاقوامی تجارت کو فروغ دینے کی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ فی زمانہ بیرونی تجارت کے لئے بغیر سود کے کوئی چارہ نہیں۔ اسلامی ممالک کو اگر آج کل کے بین الاقوامی ماحول میں زندہ رہنا ہے۔ تو انہیں کم از کم تجارتی اور گورنمنٹ کے قرضے کے سود کے جواز کے امکان کے متعلق مزید سوچ بچار کرنا ہوگا۔ اور پچھلے زمانہ کے فقہا کی اندھی تقلید کی بجائے موجودہ زمانے کے تبدیل شدہ حالات کو سامنے رکھ کر اسلامی قانون متعلقہ سود کی دوبارہ تدوین کرنی ہوگی۔

مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم ترجمان القرآن میں سورہ بقرہ کی آیت "یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ "دین حق میں اصل آسانی ہے نہ کہ تنگی"۔ مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں۔ "پس یہ قاعدہ اسلام میں مسلّم ہے کہ جہاں مشقت اور ضرر ہو وہاں احکام میں نرمی کر دی جائے۔ اگر آج کل کے زمانہ میں صنعت و تجارت کے مقابلہ کے لئے اور گورنمنٹ کو اپنی بقاء کے لئے قرض لینے کے سوا چارہ نہیں اور اگر اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ عرب جاہلیت میں اس قسم کے قرض رائج تھے تو کیا ہمیں احکام تحریم "ربوا" کی تعبیر کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی اس عطا کردہ آسانی سے فائدہ نہ اٹھانا چاہیئے۔ لیکن ہمارے بزرگان کا رویہ اس کے برخلاف ہے۔ ان میں سے اکثر تو یہ مانتے ہیں کہ جو چیز قرآن مجید نے حرام قرار دی ہے وہ وہ ہے جس کو اس وقت کے عرب "ربوا" کے اصطلاحی نام سے یاد کرتے تھے لیکن باوجود اس کے کہ ان کے پاس اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ ان دنوں عرب میں نفع آور کاموں کے لئے بھی قرض لیا جاتا تھا۔ تقریباً سب ہر قسم کے قرض پر سود کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ میں یہ گزارش پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ جب تک اس کا ثبوت نہ مل جائے کہ ایام جاہلیت میں نفع آور کاموں کے لئے بھی سود پر قرض لیا جاتا تھا ہمیں "الربوا" کو حاجتمندانہ اور صرفی قرضوں تک ہی محدود رکھنا چاہیئے اور صرف گمان کی بناء پر سود کی

اور صورتوں کو حرام کر لینے کی تنگی میں نہ پھنس جانا چاہیئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے سورۂ بقرہ کی مندرجہ ذیل آیات کا جو ترجمہ "ترجمان القرآن" میں کیا ہے اس سے میری گزارش کو کچھ سہارا سا ملتا دکھائی دیتا ہے۔

الذین یاکلون الربوا (حاجت مندوں کی مدد کرنے کی جگہ اُلٹا اُن سے) سود لیتے ہیں۔

یمحق اللہ الربوا و یربی الصدقات اللہ سود کو مٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے (یعنی سود خواری کو مٹانا چاہتا ہے۔ جس کا مقصد حاجتمند کی حاجت روائی کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اُس کو فائدہ پہنچانا ہے۔

اس نظریہ پر کہ قرآن مجید نے صرف اُس سود کو حرام کیا ہے جو اُس وقت عرب میں رائج تھا۔ ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ "یہ استدلال اس وقت تک نہیں چل جب تک یہ فرض نہ کر لیا جائے کہ انسانی معاملات میں اللہ اور اُس کے رسولؐ کا علم بھی انہی معاملات تک محدود تھا جو نزولِ قرآن کے دور میں رائج تھے۔ اور انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ آگے کیا کچھ آنے والا ہے۔ نیز یہ کہ اسلام صرف ایک وقت خاص کے معاملات میں رہنمائی دینے والا ہے۔ کوئی ازلی و ابدی رہنما نہیں ہے۔" میری مؤدبانہ عرض ہے کہ میرے استدلال پر ان مفروضات کا اطلاق نہیں ہوتا۔ میں اللہ تعالیٰ کے علم کی لامحدودیت اور اسلامی احکام کی

ابدیت پر ایمان رکھتا ہوں اور اسی وجہ سے میری التجاء ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حرام
کی ہوئی چیزوں میں ہم اپنی طرف سے ایزادی نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے جو بڑھوتری حرام
قرار دی تھی۔ وہ وہ تھی۔ جس کو اس وقت کے عرب "ربوا" کہتے تھے۔ اگر عربوں
میں یہ نام ان دنوں ایسی بڑھوتری کے لئے ہی استعمال ہوتا تھا جو حاجت مندانہ
اور صرفی قرضوں پر لی جاتی تھی تو ہمیں کیا اختیار ہے کہ اس کو اس سے زیادہ وسیع
معنے دیں اور ایسے قرضوں کی بڑھوتری کو بھی اس میں شامل کر لیں جن میں حاجتمندانہ
اور صرفی قرضوں کی خرابیاں نہیں پائی جاتیں۔ صرف نام سے تو حرمت کا اطلاق
نہیں ہو جاتا۔ اگر کسی شربت کو شراب کہہ دیا جائے تو وہ حرام تو نہ ہو جائے گا۔
جب تک اس میں نشہ لانے والی ضرر رساں صفت موجود نہ ہو۔ اسی طرح کسی سود
کو جس میں وہ نقائص نہ پائے جاتے ہوں جو حاجتمندانہ اور صرفی قرضوں کے سود میں
موجود ہیں "ربوا" نہ کہنا چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع (سنہ
ہجری ۱۰) میں جو خطبہ دیا اس میں فرمایا۔ "ربا الجاھلیۃ موضوع" یعنی جاہلیت
کا "ربوا" باطل کر دیا گیا۔ یہاں بھی اشارہ جاہلیت کے سود کی طرف ہے۔ نہ
کہ دنیا کے ہر قسم کے سود کی طرف۔ محمد ابو سعود صاحب جو ایک مصری عالم ہیں اور

26- Islamic Review Feb. 1957
Islamic view of Ribaa.

کچھ عرصہ ہُوا ہمارے سٹیٹ بنک میں ایڈوائزر کے عہدہ پر فائز تھے، لکھتے ہیں کہ حضرات ابنِ قدامہ اور ابنِ تیمیہؒ کی رائے میں "ربا المنسیہ" کا اطلاق اسی قسم کے قرضوں پر ہوتا ہے جن کا رواج زمانہ جاہلیت میں تھا۔

مولانا ظفر احمد صاحب رسالہ کشف الدجیٰ عن وجہ الربوا میں فرماتے ہیں، "طحاویؒ" نے بھی اس کی تصریح کی ہے کہ جو "ربوا" جاہلیت میں متعارف تھی قرآن مجید میں اسی ربوا کا ذکر ہے اور طبری نے مجاہد سے اس مضمون کو ان لفظوں سے روائت کیا ہے کہ جس "ربوا" سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں کسی کا دوسرے کے ذمّے دَین ہوتا تو مدیون سے کہتا کہ مَیں تم کو اتنا زیادہ دوں گا۔ مجھے مہلت دے دو۔ اس پر وہ مہلت دے دیتا۔"

میرے ایک اَور محترم دوست نے فرمایا ہے۔ "غور فرمائیے کہ ہمارے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زاویہ ہائے نظر میں کتنا اختلاف ہے۔ ہم تو اس کوشش میں ہیں کہ "ربوا" کی کوئی بھی نئی صورت ہو تو اُسے حلال کر لیں اور حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جس قدر "ربوا" کی شکلیں ہیں، اُن کو تو حرام سمجھو ہی گے۔ ان کے علاوہ بھی اگر کسی میں "ربوا" کا شائبہ ہو تو اُسے بھی حرام سمجھو۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان دونوں نظریات کی بنا ایک ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے "ربوا" کی تمام شکلوں کو کھول کر بیان نہیں فرمایا۔ کیا ہم اس سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے۔ اللہ اللہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک، ہم گنہگاروں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تقویٰ کی امید

بے سود ہے لیکن پھر بھی اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو شاید یہ اختلاف مفقود ہو جائے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ "ربوا" کسے کہتے تھے اور اگر اس کا اطلاق صرف ایسے سود پر ہوتا تھا جو حاجتمندانہ یا اضطراری یا صرفی قرضوں پر لیا جاتا تھا تو بلا شبہ "ربیہ" کی صورت بھی ایسی ہی ہو گی جس میں اس قسم کے سود کی برائیوں اور نقصانات کی جھلک ہو یعنی جس میں کسی کی حاجت مندی اور ناداری سے فائدہ اُٹھایا جائے۔

اُوپر کی بحث میں جو زاویۂ نظر پیش کیا گیا ہے وہ مجملاً یہ ہے اول "الربوا" سے وہ سود مراد ہے جو حاجتمندانہ اور صرفی قرضوں پر لیا جاتا ہے اور دوم قرض کی ان قسموں کے علاوہ اور بھی قسمیں ہیں۔ مثلاً وہ جن کا روپیہ نفع آور (PRODUCTIVE) کاموں میں لگایا جاتا ہے یا جو گورنمنٹ لیتی ہے۔ ان کے سود پر قرآنی حرمت عاید نہیں ہوتی اور ان کے متعلق قوم کو اختیار ہے کہ اپنی ضروریات کے مطابق لیکن قرآنی اصولوں کے ماتحت فیصلہ کرے۔ اسلام میں اکتنا اور احتکار ممنوع ہے۔ اُسے یہ بھی پسند نہیں کہ آدمی نکھٹو بنا رہے اور اپنی روزی کے لئے محنت نہ کرے۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں :۔

والذین یکنزون الذھب والفضۃ	جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اُس کو
ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشر	اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ اُن کو عذاب الیم
ھم بعذاب الیم ؕ	کی خبر دے دو۔

کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم۔ — تاکہ ایسا نہ ہو۔ مال و دولت مندوں کے گروہ میں ہی محصور ہو کر رہ جائے۔

لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ — نہیں ملتا انسان کو مگر جس کے لئے وہ کوشش کرے۔

چنانچہ میری رائے ناقص میں اسلام اصولاً اس چیز کو پسند نہیں کرتا کہ اس کا کوئی پیرو سود یا زمین اور مکانوں کے کرایہ پر گزراوقات کرے۔ لیکن یہ مناہی حاجتمندانہ اور صرفی سود کے علاوہ حرمت کی حد تک نہیں پہنچتی اور نہ ہی گورنمنٹ پر (یا قوم پر بحیثیت مجموعی) حاوی ہوتی ہے۔ اس لئے اگر نفع آور کاموں کے لئے سود پر سرمایہ اکٹھا کرنا ہو تو اس کا احسن طریقہ یہی ہوگا کہ سلطنت خود اس کا انتظام کرے اور اس کے لئے گورنمنٹ اپنے بنک چلائے۔ لیکن جہاں اور جب تک یہ ممکن نہ ہو افراد کے لئے اس قسم کا سود لینا اور دینا ممنوع نہ ہونا چاہیئے۔ باقی رہا وہ سود جو حاجت مندانہ اور صرفی قرضوں پر لیا جاتا ہے۔ یہ چونکہ حرام ہے۔ اس لئے گورنمنٹ کو ایسا انتظام کرنا چاہیئے کہ ایسے قرض لوگوں کو بغیر سود کے مل جائیں۔ اس کا بہتر طریقہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ امداد باہمی کی سوسائٹیوں یا بنکوں کی معرفت اس کا انتظام کیا جائے اور جہاں ضرورت ہو سلطنت خود زکوٰۃ وصول کر کے بیت المال سے ان کو سرمایہ مہیا کرے۔ اس سلسلہ میں اس امر کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ حیدر آباد دکن میں تقسیم ملک سے پہلے کم از کم ایک ایسی امداد باہمی کی سوسائٹی[1] موجود تھی۔ جو بغیر سود

[1] معارف ۱۹۳۷ء صفحہ ۲۱۱-۲۱۶ جس کا شیخ محمود احمد صاحب نے اپنی کتاب اکنومکس آف اسلام میں حوالہ دیا ہے

کے چلائی جاتی تھی۔

"ربوا" کی رائج الوقت تعبیر کے متعلق جو شبہات میرے ذہن میں اُٹھے۔ اُن کو آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس مسئلہ کا فیصلہ تو بزرگانِ دین اور علمائے کرام ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر میں ان کی توجہ اس کی اہمیت کی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہو سکوں اور ان کی خدمت میں یہ گذارش پہنچا سکوں کہ آج کل کے تبدیل شدہ معاشی حالات میں اس پر نئے سرے سے آزادانہ بحث کی ضرورت ہے تو مَیں سمجھوں گا کہ مَیں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

جو نظریہ گذشتہ سطور میں آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کی بنا اس پر ہے کہ عرب جاہلیت میں نفع آور کاموں کے لیئے سود پر قرض نہ لیا جاتا تھا۔ لیکن مجھے اپنی کم علمی کا پورا احساس ہے۔ مَیں نے ایمانداری کے ساتھ اس بات کو معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ آیا ان دنوں ایسے قرض رائج تھے۔ لیکن مجھے اِس کے ثبوت میں کوئی معتبر روائت نہیں مل سکی۔ اگر کسی صاحب کو کوئی ایسا قابلِ اعتبار حوالہ معلوم ہو۔ جس سے اِس مفروضہ کی صحت پر حرف آسکے تو ازراہ کرم اس سے مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

کئی فاضل بزرگوں نے تجارتی سود کی بعض برائیوں کی طرف توجہ دلا کر اس کی حرمت کے حق میں اِستدلال کیا ہے۔ مثلاً ان کا خیال ہے کہ جو تجارتی چکر (   ) آتے ہیں ان کی ذمہ داری سود ہی پر عائد ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ جب کساد بازاری

ہو۔ اگر اس وقت سود کا بار صنعت پر دپڑے تو اشیاء سستی رہ سکیں گی۔ لوران کی مانگ زیادہ ہو گی۔ لیکن کوئی ماہرِ معاشیات آج تک یہ نہیں کہہ سکا کہ اگر سود ممنوع قرار دے دیا جائے تو اس سے تجارتی چکر بند ہو جائے گا۔ بعض حضرات اِس بحث میں پڑ گئے ہیں کہ سود کس چیز کا عوض ہے۔ ہمیں اِس چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں جب تک ایک صنعت کار مزید سرمایہ حاصل کر کے زیادہ فائدہ کما سکتا ہے وہ اس کی قیمت دینے کو تیار ہو گا اور اسی قیمت کا نام سود ہے۔ بعض اصحاب نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ سود پر قرض کی بجائے اور ذریعوں سے بھی بڑی مقدار میں سرمایہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً شراکت یا مضاربت سے۔ لیکن ماضی کا تجربہ اس کے برخلاف رہا ہے۔ اِس سلسلہ میں ایک بات قابلِ غور ہے۔ حالانکہ سود کی مناہی کمیونزم کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ اور اشتراکی ممالک میں سب نفع آور ذرائع گورنمنٹ کی ملکیت ہوتے ہیں۔ پھر بھی روس کو کسی حد تک سود کی اجازت دینی ہی پڑی۔

۲

سُود خواری کی قسمیں

حدیث کی روشنی میں

ہماری دقتیں چھوٹے چھوٹے اور محدود معاملات و عادات کو رائج کرنا یا ختم کرنا زیادہ دشوار نہیں لیکن مال کا معاملہ دلوں میں کچھ ایسا پیوست ہوتا ہے کہ اسے اُکھاڑنے کے لئے ایک تو ذہنی تبدیلی اور محکم اخلاقی بلندی پیدا کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ دوسرے یہ بھی لازم ہوتا ہے کہ ایک ہمہ گیر اور بیخ گرفتہ نظام کو بدلنے سے جو نقصان دکھائی دیتا ہو اس کی تلافی کا سامان بھی پیدا کر دیا جائے جو اس کا بدل اکمل ہو اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے بڑے گہرے غور و فکر کی اور انتہائی محتاط قدم اُٹھانے کی ضرورت ہو گی۔ اِس پیچیدگی کو محض ایک مفتی حل نہیں کر سکتا۔ اِسے وہ مردِ مومن حل کر سکتا ہے جو ایک طرف تو اپنی روح کی گہرائیوں میں اسلامی اقدار کو جذب کئے ہوئے ہو اور دوسری طرف اقتصادیات و معاشیات

کے خم پر عبور کامل رکھتا ہو اور دنیا کے نظام معاش، نظام تجارت اور رائج الوقت اصولِ مبادلہ پر گہری نگاہ رکھتا ہو۔

فاروق اعظمؓ کی حسرت مسئلہ ربوا (سود) کی نزاکت کا اندازہ سیدنا عمرؓ کے اس جملے سے کیجئے:۔

..... ثلٰث وددت ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان عہد الینا فیھن عہدًا ننتھی الیہ الجد والکلالۃ و ابواب الربوا۔ (رواہ الستۃ الا مالکا)

تین باتیں ہیں جن کے متعلق مجھے تمنا ہوتی ہے کہ کاش حضورؐ ان کے متعلق واضح اور آخری احکام بتا جاتے۔ ایک دادا کا ترکہ اور دوسری کلالہ کا حصّہ اور تیسری سود کی بعض قسمیں۔

یہ جملہ اُس شخص کی زبان سے نکلا ہے۔ جس کے ہاتھ میں تقدیرِ امم ہے جس کے قبضے میں دنیا کی اقتصادی پالیسی ہے۔ اور یہ جملہ اس وقت نکلا ہے جبکہ عہدِ نبوّت کو ابھی چند سال ہی گذرے ہیں اور ایسی حالت میں نکلا ہے جبکہ تمدّن تھما ہوا ہے زندگی سادی ہے۔ لین دین کا طریقہ سہل ہے، معاملات پیچیدہ نہیں، بینکوں کا تصوّر تک نہیں مبادلۂ زر میں کوئی دشواری نہیں۔

ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ جب ان حالات میں سیدنا عمرؓ جیسا انسان مسائل ربوا میں اُلجھن محسوس کرتا ہے۔ تو آج جبکہ ساری دنیا کا نظام اقتصادیات انتہائی پیچیدہ

۴۔ کیوں نہ شدید اُلجھنیں محسوس ہوں گی۔

اسلام کا موقف

اسلام محض چند خوش آیند اور خیالی تصوّرات کا نام نہیں۔ بلکہ یہ حقائق سے بحث کرتا ہوُا زندگی کے اُن ٹھوس مسائل کو حل کرتا ہے۔ جن سے انسان کو نہ انفراداً مفر ہے نہ اجتماعاً۔ اسلام اُن تمام راستوں سے آتا ہے جن کا کچھ بھی تعلق مسائلِ حیات سے ہے۔ معاشیات کو انسانی زندگی میں غیر معمولی دخل ہے اور معاشیات ہی کے سلسلے میں وہ لین دین بھی آتا ہے جسے سودی کاروبار کہتے ہیں۔ شائد کسی جرم کے لئے قرآن پاک میں ایسی سخت تہدید نہیں آئی ہے جیسی سودخواری کے لئے وارد ہوئی ہے۔ ارشاد ہے کہ :-

فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ۔

اگر تم اس سے باز نہیں آتے تو اللہ اور اُس کے رسولؐ سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔

ربوا کی وسیع گرفت

اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشی اور ساتھ ہی اخلاقی توازن میں سود سے زیادہ اَور کوئی شے بگاڑ پیدا کرنے والی نہیں۔ اِسلام اِسے ساری دنیا سے ہمیشہ کے لئے ختم کردینا چاہتا ہے اِس کے باوجود یہ بھی صحیح ہے کہ جہاں یہ نحوست جڑ پکڑے ہوئے ہو۔ وہاں سے اسے یک لخت ختم نہیں کیا جا سکتا ورنہ اس سے دوسری قسم کا ویسا ہی بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔ اسے بھی بنائی کی طرح بتدریج ختم کرنا چاہیئے۔ سودخواری ہمیشہ ہی سے بُری چیز

تھی حتیٰ کہ شریعتِ موسوی میں بھی یہ قریبی ہی حرام ہے لیکن اس کی حرمت کا حکم ہجرت کے بھی کئی سال بعد نازل ہؤا۔ یہ تاخیر بتاتی ہے کہ اسے دفعتاً ختم کرنا مناسب نہ تھا۔ علاوہ ازیں سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اس کی تحریم اسی وقت مؤثر ہو سکتی ہے۔ جب دنیا کے معاشی نظام کی کنجی اپنے ہاتھ میں آجائے۔ ساری دنیا میں ایک چیز عالمگیر طور پر رائج ہو تو ایک آدھ چھوٹا معاشرہ خود اپنی برادری میں بھی اسے ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ آج دنیا کے کاروبار اس طرح ایک دوسرے سے گتھے اور جڑے ہوئے ہیں کہ کسی رائج الوقت روِش کاروبار کو تنہا ایک قوم یا ایک ملک ختم کر کے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً وُہ ملک یا قوم جس کے ہاتھ میں معاشیات کی عالمی پالیسی نہ ہو۔

ربوٰا اور احادیث

ربوٰا کا تصور اس حدیثِ نبویؐ سے پیدا ہوتا ہے۔ جس میں "والفضل ربوا۔" (زائد حصّہ سود ہے) فرمایا گیا ہے۔ یعنی جتنا دیا جائے اتنا ہی واپس لیا جائے۔ اگر زاید لیا دیا جائے گا۔ تو وہ ربوا ہو گا۔ "الفضل ربوا" گویا ایک نہایت مختصر اور جامع تعریف ہے سود کی۔ لیکن زندگی پر اس کا کہاں کہاں اور کس کس شکل سے اثر پڑتا ہے اور کس کس طرح کے شبہات و تشابہات پیدا ہو کر مسئلہء ربوا کو پیچیدہ بنا دیتے ہیں۔ ان باتوں کا اندازہ اس سے کیجئے کہ خود عہدِ رسالتؐ میں اور حضورؐ کے بعد ہی ایسی ایسی صورتیں سامنے آئیں کہ روایات بھی آپس میں ٹکرانے لگیں۔ ظاہر ہے کہ جب سیدنا عمرؓ کو یہ فیصلہ کرنے

میں دشواری پیدا ہوئی کہ فلاں فلاں لین دین کو ربوا میں شامل کیا جائے یا نہ کیا جائے تو آج تو اور زیادہ مشکلات پیش آئیں گی۔ خصوصاً اس لئے کہ جو روایات ربوا پر روشنی ڈال سکتی ہیں۔ وہ بظاہر آپس میں متناقض سی معلوم ہوتی ہیں۔

ہم پہلے ان روایات کو یہاں درج کریں گے۔ اس کے بعد ان سب کو سامنے رکھتے ہوئے اس قدر مشترک کو دریافت کرنے کی کوشش کریں گے جو نہ فقط ان روایات میں موجود ہے بلکہ اس کی روشنی میں ہم دوسرے پیش آمدہ صورت حال کو حل کرنے میں بھی مدد لے سکتے ہیں۔ ہماری یہ کوشش ایک لحاظ سے احادیث مندرجہ کی شرح بھی ہے۔

دو مختلف جنسوں کا مبادلہ بھی دست بدست ہونا چاہیئے:

(ابو سعیدؓ) رفعہ: الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل ید ابید فمن زاد واستزاد فقد اربیٰ الاٰخذ والمعطی فیہ سواء (للستۃ الا ابا داؤد بلفظ مسلم)

مبادلہ سونے کا سونے سے، چاندی کا چاندی سے۔ گندم کا گندم سے جو کا جو سے، خرمے کا خرمے سے اور نمک کا نمک سے برابر ہونا چاہیئے جو زیادہ دے گا یا لے گا۔ وہ سود ہوگا۔ اس میں لینے والا اور دینے والا دونوں یکساں ہیں۔

ربوا صرف ادھار کی صورت میں ہوتا ہے:

(ابن عباسؓ) اخبرنی اسامۃ بن زید ان النبی صلی اللہ وسلم

قال لاربوا الا فی النسیئۃ۔)

اسامہ بن زیدؓ نے مجھ سے یہ حدیثِ رسولؐ بیان کی ہے کہ ربوا ہوتا ہی ہے اُدھار میں (یعنی اگر دست بدست اور نقد انقد ایک ہی جنس کی چیز کا مبادلہ تفاضل یعنی کمی بیشی سے بھی ہو تو ربوا نہیں)

جنس مختلف ہو تو تفاضل ربوا نہیں بشرطیکہ نقدا نقد ہو:۔

(ابن الصامت) رفعہ الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواء بسواء ید ابید فاذا اختلف ھذہ الاصناف فبیعوا کیف شئتم اذا کان ید ابید (ھما لمسلم واصحاب سنن)

مبادلہ سونے کا سونے سے۔ چاندی کا چاندی سے، گندم کا گندم سے جَو کا جَو سے، خرمے کا خرمے سے اور نمک کا نمک سے ہونے میں تفاضل اُس وقت ناجائز ہے جبکہ دونوں طرف ایک جیسی چیز ہو اور دست بدست ہو۔ اگر دونوں کی صنفیں مختلف ہوں (مثلاً ایک طرف معمولی گندم ہو اور دوسری طرف نفیس گندم تو جس طرح چاہو معاملہ کرلو۔ بشرطیکہ وہ دست بدست ہو۔

دینار کی بجائے ہم قیمت درہم لینے میں یا اس کے برعکس میں کوئی مضایقہ نہیں:-

(ابن عمرؓ) کنت ابیع الابل بالبقیع فابیع بالدنانیر فآخذ مکانہا الورق وابیع بالورق فآخذ مکانہا الدنانیر فاتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسألت فقال لاباس بہ بالقیمۃ.
(لاصحاب سنن)

میں بقیع میں دینار کی قیمت سے اونٹنی بیچ کر اس کی بجائے درہم لیا کرتا تھا۔ اور درہم کی قیمت لگا کر اس کی جگہ دینار لیتا تھا۔ پھر میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بیع کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ دونوں کے داموں میں تفاوت نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

ایک اونٹ کا مبادلہ دو اونٹوں سے:

(ابن عمرو بن العاص) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم امرہ ان یجھز جیشا فنفدت الابل فامرہ ان یأخذ علی قلائص الصدقۃ فکان یأخذ البعیر بالبعیرین الی اجل الصدقۃ (لابی داؤد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن عمرو کو ایک جیش تیار کرنے کا حکم دیا۔ اتفاق سے چند اونٹنیاں بھاگ گئیں تو حضورؐ نے حکم دیا کہ صدقے کے اونٹوں میں سے لیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایک اونٹ کے

بدلے دو دو اونٹ لئے۔

ایک بڑے اُونٹ کا مبادلہ میں چھوٹے اُونٹوں سے اور وہ بھی اُدھار:۔

(علیؓ) باع جملا له یدعی عصیفیر بعشرین ابعیراً الی اجل

(مالکؒ)

حضرت علیؓ نے اپنا ایک اُونٹ جس کا نام عصیفیر تھا۔ بیس بعیر (چار سال سے نو سال تک کے اُونٹ) کے عوض فروخت کیا۔ یہ عوض ایک میعاد کے بعد لینا طے ہوا تھا۔

ایک جانور کے عوض دو جانور نقداً نقد:۔

(جابرؓ) رفعه: لا یصلح الحیوانان اثنان بواحد نسیئةً ولا باس به یداً بید (للترمذی)

ایک جانور کے عوض دو جانوروں کی بیع درست نہیں لیکن اگر دست بدست ہو تو حرج نہیں۔

قرض میں خوش دلی کے ساتھ تفاضل

(ابن عمرؓ) استلف دراهم فقضی صاحبها خیرا منها فابی ان یاخذ وقال هذه خیر من دراهمی فقال ابن عمر قد علمت ولکن نفسی بذالك طیبة (مالکؒ)

عبداللہ بن عمرؓ نے کچھ درہم قرض لئے اور جب ادا کئے تو اس سے بہتر درہم دئے۔ اس نے لینے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ یہ میرے درہموں سے بہتر قسم کے ہیں۔ فرمایا: مجھے اس کا علم ہے۔ لیکن میں خوش دلی کے ساتھ یہ دے رہا ہوں۔

ربوا کی بدترین قسم:

(البراء بن عازب) رفعہ: الربوا ثنان وسبعون بابا ادناھا مثل اتیان الرجل امہ وان اربی الربا استطالۃ الرجل فی عرض اخیہ۔ (اوسط)

ربوا کی بہتر یعنی بے شمار قسمیں ہیں۔ اس کا جو کم سے کم درجہ ہے وہ ایسا ہے جیسے اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرنا اور اس کی بدترین قسم اپنے بھائی کی آبرو پر ہاتھ صاف کرنا۔

ربوا کی سب سے معمولی قسم

(ابوھریرہؓ) رفعہ الربوا سبعون حوبا ایسرھا ان ینکح الرجل امہ۔ (قزوینی)

گناہ ربوا کی ستر (بے شمار) قسمیں ہیں اور اپنی ماں سے نکاح کرنا اس کی سب سے کم درجے کی قسم ہے۔

خلاصہ | ربوا (سود) کی ان تمام روایات کو پیش نظر رکھئے تو خلاصہ یہ نکلتا

ہے۔ کہ

(۱) دو مختلف جنسوں (مثلاً سونے اور چاندی) میں بھی مبادلہ دست بدست ہی ہونا چاہیئے (روائت حضرت عمرؓ)

(۲) ربوا صرف نسیہ یعنی ادھار میں ہوتا ہے۔ (روایت ابنِ عباسؓ عن اسامہ)

(۳) دو ہم جنس مثلاً گندم اور گندم) میں تفاضل کے ساتھ مبادلہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ دونوں کی کوالٹی مختلف ہو اور معاملہ نقداً نقد ہو۔ (روائت ابنِ صامت)

(۴) کوئی چیز دینار کے حساب سے فروخت کر کے اتنے ہی کے درہم لینے میں کوئی مضائقہ نہیں اور نہ اس کے برعکس کرنے میں۔ (روایت ابنِ عمرؓ)

(۵) زیادہ دام کی ایک چیز (مثلاً بڑا اونٹ) دے کر اسی جنس کی کم قیمت چیز (مثلاً چھوٹے اونٹ) زیادہ لے سکتے ہیں۔ خواہ اُدھار ہی کیوں نہ ہو۔ (روائت ابنِ عمرو بن العاص)

(۶) یہی صورت اگر نقداً نقد ہو تو بطریقِ اولیٰ جائز ہے۔ (روایت جابرؓ)

(۷) قرض کی واپسی میں خوش دلی کے ساتھ زیادہ دے دینا تفاضل نہیں (روایت ابن عمرؓ)

نتیجہ اب ان سب روایات کو ملا کر دیکھئے تو بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ :۔

(۱) ایسا کوئی احمق نہیں جو ایک سیر گندم دے کر اسی نوعیت اور اسی قیمت کا ایک سیر گندم لے۔

(۲) یہ بھی کوئی نہیں کرے گا۔ کہ جان بوجھ کر ایک سیر لے اور سوا سیر بالکل وہی گندم دے۔

(۳) ایسے مبادلے کی وجہ لامحالہ یہ ہوگی۔ کہ

(الف) ایک گندم مثلاً دس آنے سیر کا ہوگا اور دوسرا بارہ آنے سیر کا یعنی کوالٹی مختلف ہوگی۔

(ب) یہ معاملہ ادھار (نسیئہ) کا ہوگا۔

اب دیکھئے

پہلی صورت میں دس سیر عمدہ (یعنی بارہ آنے سیر والا) گندم دے کر معمولی (یعنی دس آنے سیر والا) گندم بارہ سیر لیا جائے گا۔ خواہ نقد ہو یا اُدھار۔ اس میں نہ کوئی ظلم ہے نہ سود۔ بلکہ یہاں دس سیر کے عوض دس سیر لینا سود لینے یا دینے میں شمار ہوگا۔

دوسری صورت یعنی اُدھار میں یہ شکلیں نکل سکتی ہیں۔ کہ :

(الف) یا تو عمدہ دس سیر کے عوض معمولی بارہ سیر لیا جائے گا۔

(ب) یا زیادہ مثلاً پندرہ سیر۔

ج۔ یا برابر یعنی دس سیر۔

د۔ یا کم مثلاً آٹھ سیر۔

یہاں پہلی صورت میں نہ کوئی سود ہے۔ نہ ظلم۔

دوسری صورت سود لینے کی ہے۔

تیسری صورت سود دینے کی ہے۔ اگرچہ بظاہر موزون ہیں اور چوتھی بھی علیٰ ہذا القیاس۔

یہی دوسری۔ تیسری اور چوتھی شکل ہے جس سے روکا گیا ہے۔ کیونکہ مبادلہ کرنیوالے ضرورتمند کا اس میں نقصان ہے۔ لیکن اس میں بھی بعض پیچیدہ شکلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً

وعدے کے مطابق دس سیر عمدہ گندم کے عوض بارہ سیر معمولی گندم ہی دینا چاہیئے لیکن فرض کیجیئے ادا کرتے وقت معمولی گندم کی قیمت چڑھ جاتی ہے اور وہ دس آنے کی بجائے بارہ آنے سیر ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں:۔

وعدے کے لحاظ سے اسے بارہ سیر ادا کرنا چاہیئے۔

اور موجودہ بھاؤ کے لحاظ سے فقط دس سیر ہونا چاہیئے۔

لیکن ان دونوں شکلوں میں ایک ایک پہلو ربوا کا پیدا ہو جاتا ہے۔ گذشتہ عہد کے لحاظ سے بارہ سیر سے کم لینے میں سود دینے کا پہلو پیدا ہوتا ہے اور موجودہ بھاؤ کے لحاظ سے دس سیر سے زیادہ لینا۔ سود لینے میں داخل ہو جاتا ہے۔

احتیاطی تدابیر

اس پیچیش سے بچنے کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ:۔

(۱) یا تو اُدھار کا معاملہ ہی ختم کر دیا جائے۔ نہ اُدھار ہو نہ جھگڑا

سامنے آئے۔ پس جو کچھ ہو نقداً نقداً دست بدست ہو، یہی مقصد ہے، یداً بیدٍ کا۔ اس صورت میں تفاضل اسی وقت ہوگا جب دونوں جنسوں کی نوعیت وقیمت میں فرق ہو۔ اور یہ اُوپر واضح ہو چکا ہے کہ یہ بلاشبہ جائز ہے۔

(۲) اگر اُدھار ہو تو اس کی دو صورتیں ہوں گی:

(الف) بدلے میں ایسی ہی چیز دی جائے تو ناپ یا تول سے دی جائے یعنی دس سیر عمدہ گندم کے عوض ویسا دس سیر عمدہ گندم اور دس گز کپڑے کے عوض بالکل ویسا ہی دس گز کپڑا یہی مطلب ہے۔ مثلاً بمثل کیلاً بکیل وزناً بوزن سواءً بسواءٍ کا۔ اگر اس کی ناپ تول میں بھاؤ بدل جانے کی وجہ سے یا کسی دوسری وجہ سے کمی بیشی کی گئی تو ربوٰا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر دس گز ململ کے عوض ویسی ہی دس گز ململ واپس کرنے کا عہد تھا تو خواہ وہ جس قیمت پر ملے ویسی ہی ململ واپس کرنی چاہیئے۔ یہاں قیمت کی کمی بیشی ربوٰا نہیں بلکہ اصل شے کی کمی زیادتی ربوٰا ہوگی۔ یہی مطلب ہے والفضل ربوا کا۔

(ب) اور اگر دوسری نوعیت وقیمت کی چیز ادا کی جائے (مثلاً) عمدہ گندم کے بدلے معمولی گندم اور دونوں جنسوں کا بھاؤ وہی ہے جو مبادلے کے وقت تھا تو اس بھاؤ سے ادا کرنا ہوگا۔ مثلاً دس سیر عمدہ گندم کے عوض معمولی بارہ سیر گندم۔ یہاں بارہ سیر میں کمی بیشی کرنا ربوا ہوگا۔ لیکن اگر بھاؤ بدل گیا ہے تو وہی چپقلش سامنے آئے گی جس سے بچانا مقصود ہے۔ اس کا صرف ایک حل ہے کہ ایسے خطرے میں پڑا ہی نہ جائے یعنی گندم کے عوض گندم (خواہ کسی نوعیت وقیمت کا ہو) لینے دینے کا معاملہ ہی نہ کیا جائے بلکہ

اس کی بیع رقم یعنی سکوں کے عوض ہو۔ مثلاً خریدار کہے کہ "مجھے دس آنے سیر والا گندم دس سیر قرض دو جس کی قیمت سوا چھ روپے ہوتی ہے۔" اب یہی رقم واجب الادا ہوگی اور اگر لینے والا راضی ہو۔ تو اتنے ہی کا گندم یا اور کوئی چیز اس سے لے سکتا ہے۔

احادیث کی مشترک روح

تمام احادیث پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:-

(۱) بیع کے وقت وہی جنس کسی دوسری نوع (مثلاً عمدہ گندم کے عوض معمولی گندم) دینا ہو یا کوئی دوسری ہی جنس (مثلاً گندم کے عوض چھوہارے) دینا ہو۔ تو یہ یداً بید یعنی دست بدست معاملہ ہو۔ اس ہاتھ دو اس ہاتھ لو۔ اس میں فائدہ یہ ہے کہ موجودہ بھاؤ دونوں طرف ملحوظ رہے گا۔ (مثلاً سوا چھ روپے کا گندم دس سیر آتا ہے اور چھوہارے بارہ سیر تو یہ تفاضل ربوا نہیں ہوگا بلکہ عین مطلوب ہوگا بلکہ تساوی کا ربوا ہونا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

(۲) اور اگر یہ معاملہ نقد نہ ہو بلکہ ادھار ہو۔ تو سودے کا معاملہ اسی جنس یا غیر جنس کے سودے سے نہ ہو بلکہ رقم یعنی سکّے کو اس کا ذریعہ بنایا جائے۔ ورنہ بھاؤ کے اُتار چڑھاؤ سے کسی ایک فریق کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور پھر جھگڑے پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ سکوں کی قیمت بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ لیکن اس کا اثر خریدار و فروشندہ سب کی تمام چیزوں پر پڑتا ہے یعنی اگر روپے کی قیمت

کم ہو گئی ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ تقریباً تمام ضروریات زندگی پر اس کا اثر پڑا ہے اور وہ نسبتاً مہنگی ہو گئی ہیں۔ اور اگر روپے کی قیمت بڑھ گئی ہے تو چیزیں سستی ہو گئی ہیں۔ بخلاف اس کے اگر کپڑا یا کھجور ارزاں ہو جائے تو کوئی ضرور نہیں کہ دیا سلائی اور ریوڑ بھی اسی نسبت سے ارزاں ہو جائے۔ اگر دوسری چیز پر اثر پڑتا بھی ہے تو وہ بواسطہ سکہ پڑتا ہے۔

(۳) ہمیں تمام احادیث میں جو روح نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ جنس مبادلہ سودوں کو نہ بنایا جائے۔ جسے (BARTER SYSTEM) کہتے ہیں۔ بلکہ ایسی چیز کو بنایا جائے جو خود سودا نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا ذریعۂ مبادلہ صرف رقم یا سکہ ہی ہو سکتا ہے۔ جسے (MONEY ECONOMY) کہتے ہیں۔

البتہ ہمارے لئے یہ فیصلہ ذرا مشکل ہے کہ حجرین (سونے اور چاندی) میں کس چیز کو معیار قرار دیا جائے؟ نبوی دور میں اور خلفائے راشدین کے عہد میں یہ دونوں کچھ مخلوط سے معیار تقوم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن آج ہم ساری دنیا کے مقرر کردہ معیار سے آسانی کے ساتھ قطع نظر نہیں کر سکتے۔ ہم جب ایشیا سے تعلق رکھتے ہیں اس میں سونے (گولڈ) اسٹرلنگ ہی کو معیار بنانا پڑے گا یا کبھی ڈالر کو۔

ربوا کی حقیقت کیا ہے؟

ربوا کے سلسلے میں ایک ضروری نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ اوپر جو احادیث نقل کی ہیں۔ ان میں یہ بھی موجود ہے کہ ربوا کی کچھ اوپر ستر (یعنی بکثرت) اقسام ہیں حتیٰ کہ نکاح محرمات اور

کسی مسلمان کی آبروریزی بھی ربواہی کی اقسام میں داخل ہیں"۔ کچھ اقسام خرید وفروخت سے بھی تعلق رکھتی ہیں سب کو ملا کر دیکھا جائے۔ تو یہ نظر آئے گا۔ کہ ربوا دراصل ایک ذہن ہے۔ ایک خاص رجحان اور مخصوص جذبۂ دروں ہے۔ یہ ایک ظلم ہے جو خود غرضانہ نفع اندوزی۔ یک طرفہ منافع اور دوسروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ یہ ضد ہے انفاق کی جو اسلام کی اخلاقی، معاشی اور معیشی زندگی کی بنیاد ہے۔ انفاق میں اپنا ایثار ہے دوسروں کے فائدے کے لئے اور ربوا میں دوسروں کا نقصان ہوتا ہے اپنے نفعے کے لئے۔ یہ خود غرضانہ ذہنیت صرف خرید وفروخت ہی میں نہیں ہوتی۔ بلکہ زندگی کے تمام گوشوں پر پھیل جاتی ہے۔ اور یہ جہاں اور جس رنگ میں بھی ہوگی ربواہی کے کسی مرتبے پر ہوگی۔

مقتضائے انسانیت

قرض وغیرہ انسان کسی مجبوری ہی سے لیتا ہے انسانیت اور اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ مجبوری میں مجبور کی اعانت وہمدردی کی جائے۔ نہ کہ اُس کی مجبوری سے کوئی ناجائز فائدہ اُٹھایا جائے۔ قرآن پاک نے دو لفظوں میں ربوا کے اس ذہنی رجحان کو یوں بیان فرما دیا ہے لا تظلمون ولا تظلمون نہ تم ظلم کرو۔ نہ تم پر ظلم ہو۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جس گوشہ زندگی میں کوئی ایسی ذہنیت کار فرما نظر آئی وہیں فوراً اس کا نوٹس لیا اور اسی قرآنی مضمون کو لا ضرر ولا ضرار سے تعبیر فرمایا۔ یعنی نہ نقصان پہنچاؤ اور نہ نقصان اُٹھاؤ۔ اس کے بعد کے ادوار میں نہ یہ ضروری ہے کہ کوئی جدید قسم کا

ربوا نہ پیدا ہو اور نہ یہ لازم ہے کہ اس وقت کی تمام قسمیں ایک ایک کر کے آج ضرور موجود ہوں۔

نقد اور ادھار کے ثمرات

لا ربوا الا فی النسئیہ (سود صرف اُدھار میں ہوتا ہے) کا یہ مطلب نہیں کہ نقد میں سود نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ اس کے امکانات زیادہ تر اُدھار ہی میں ہوا کرتے ہیں۔ یوں ہی سمجھئے کہ ید ابید کے یہ معنی نہیں کہ دست بدست اور نقدا نقد معاملہ ہو تو اس میں ربوا نہیں ہوسکتا۔ اس کے معنی فقط یہ ہیں کہ نقد میں اس کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ جہاں کسی کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جائے۔ یا وہ بیع عدل کے خلاف ہو یا یک طرفہ فائدہ مدنظر ہو۔ یا اٹکل پچو بیع ہو یا اجتماعی نقصان ہو وغیرہ وغیرہ تو خواہ وہ نقد ہو یا ادھار، سب ربوا کی کسی نہ کسی قسم میں داخل ہوگی۔ بیع کی احادیث میں ان سب کی مثالیں موجود ہیں دیکھ لیجئے۔

ربوا، انفاق اور بیع

مختصر یہ کہ ربوا وہ جذبہ ہے۔ جس میں اپنا خود غرضانہ نفع مدنظر ہو۔ اور انفاق وہ جذبہ ہے۔ جس میں دوسروں کا نفع مقصود ہو اور بیع (تجارت) وہ جذبہ ہے۔ جس میں دونوں ہی کا نفع پیش نظر ہو۔ پس جس بیع میں پہلا جذبہ کارفرما ہو وہ ربوا کی کوئی نہ کوئی قسم ہوگی۔ اور جس بیع میں دوسرا جذبہ ہو وہ انفاق ہوگا اور جس بیع میں تیسرا جذبہ ہو وہ کسب حلال ہوگا۔ یہ

اخلاقی رجحانات کی قسمیں ہیں، محض لین دین نہیں۔ حدیث کے محض الفاظ کو پیشِ نظر رکھ کر خود غرضانہ نفع اندوزی کے حیلے تراشنا وعیدِ ربا سے نہیں بچا سکتا اور صرف الفاظ کی وجہ سے جائز نفع رسانی سے پرہیز کرنا کوئی تقویٰ نہیں۔ ہمارے نزدیک استحصال، مفت خوری، احتکار و اکتناز، ظلم، فریب وغیرہ کے ذریعے جو آمدنی ہو وہ دراصل ربا کی کسی قسم میں داخل ہے، خواہ وہ کھلی بدمعاشی کی شکل میں ہو یا مذہب کی مقدس نقاب ڈالے ہوئے ہو +

(۳)

کمرشل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت

سوال یہ ہے کہ "کمرشل انٹرسٹ کے بارے میں اسلامی فقہ کیا کہتی ہے؟ جناب یعقوب شاہ صاحب نے اس بارے میں بہت سے علماء سے سوال کیا ہے، بہت سی کتابیں اور بہت سے مضامین پڑھے ہیں، لیکن یہ پتا نہ چل سکا کہ کمرشل انٹرسٹ کے بارے میں اسلامی فقہ کیا کہتی ہے۔ قرآن میں ربوا (سود) کے متعلق ممانعت آئی ہے، جس وقت حرمتِ ربوا کے احکام نازل ہوئے اس وقت کمرشل انٹرسٹ کے وجود کا کوئی سراغ نہیں ملتا اس لئے یہ چیز زیرِ بحث آگئی کہ کمرشل انٹرسٹ کو کس پر قیاس کرنا چاہیئے؟ جائز تجارت پر یا ناجائز ربوا پر؟

کمرشل انٹرسٹ کے ترجمہ کا اثر ہم نے جان بوجھ کر عنوان میں "کمرشل انٹرسٹ" کا لفظ رکھا ہے۔ کیونکہ پہلے اس کے معانی کو واضح کرنا ضروری ہے۔ اس کا ترجمہ عام طور پر "تجارتی سود" کیا جاتا ہے۔ اور لفظ "سود" — جو "ربوا" کا بھی ترجمہ ہے۔ آجانے کے بعد ایک عامی مسلمان فی الفور

اس کو ربوا سمجھ کر حرام قرار دے دیتا ہے۔ حالانکہ اس کا ترجمہ "تجارتی منافعہ" بھی کیا جا سکتا ہے۔

کسی حرام شے کو حلال یا حلال کو حرام قرار دینے کے لئے محض لفظ کو دیکھنا کافی نہیں۔ اگر کمرشل انٹرسٹ کو "ربح" "تجارتی نفع" میں شمار کیا جائے تو اسے تجارتی منافعہ کہا جانا زیادہ موزوں ہو گا۔ اور اگر ربوا ثابت ہو تو اس کا ترجمہ سُود ہونا چاہیئے۔ اسے طے کئے بغیر ہمیں نہ تجارتی نفع کہنے کا حق ہے نہ کاروباری سُود قرار دینے کا۔ اس لئے ہم اپنے مضمون میں کمرشل انٹرسٹ کا لفظ ہی استعمال کریں گے اگر یہ فی الواقعہ ربوا ہے تو اسے ربح کہہ کر جائز نہیں کیا جا سکتا اور اگر ربح ہے۔ تو اس کا ترجمہ تجارتی سُود کرنا درست نہ ہو گا۔ جن لوگوں کے نزدیک سارے دریائی جانور حلال ہوں۔ اُن سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ گھوڑا تمہارے نزدیک بھی حرام ہے لہٰذا پانی کے گھوڑے کو بھی حرام سمجھو۔ جس طرح صرف لفظ "گھوڑا" حلت و حرمت کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح لفظ "سود" ترجمے میں آ جانے سے کمرشل انٹرسٹ کو حرام قرار دینا درست نہ ہو گا۔ تا آنکہ ربوا کا اس پر پوری طرح اطلاق نہ ہو۔

انٹرسٹ کا کیا مطلب ہے؟

ربوا کا ترجمہ عام طور پر انٹرسٹ (INTEREST) کیا جاتا ہے۔

انٹرسٹ کے معنے بیاج اور سُود کے بھی ہیں اور نفع (PROFIT) کے بھی۔ لیکن جس ربوا کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ اس کا ترجمہ (INTEREST) کی بجائے

(USURY) زیادہ صحیح ہے۔ (USURY) کے معنی آکسفورڈ ڈکشنری میں یہ لکھے ہیں:۔

The practice of changing exessive or illegal rates of interest for money on loan, Exorbitant interest for money

یعنی قرض کی رقم پر حد سے زیادہ یا غیر قانونی منافعے کی شرح وصول کرنا۔

الفرائد الدریہ میں بھی ربا کا ترجمہ یہ کیا ہے:- usury, unlawful profit یعنی ربوا کے معنی ہیں (usury) اور غیر قانونی نفع۔ گویا انٹرسٹ (Interest) کے جہاں بہت سے معانی ہیں وہاں اس کے معنی فائدہ (advantage) نفع (Profit) مفاد (Benific) بھلائی Influence over others) share in Good بھی ہیں۔

چونکہ ربوا بھی بظاہر فائدہ اور نفع ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے اسے بھی انٹرسٹ کہا جانے لگا۔ حالانکہ انٹرسٹ ایسے نفع کو بھی کہتے ہیں جو بالکل جائز ہو۔ محض نفع اور ربا کی رعائت سے اس لفظ کے معنی یہ بھی ہو گئے:۔ Money paid for the use of money lenter for forbearance of a debt according to a fixed rates..

Rate percent.

یعنی وہ رقم جو رقم قرض کے عوض یا قرض کی تاخیر ادائیگی کی برداشت کے معاوضے میں معین شرح (فی صد) کے مطابق ادا کی جائے۔

اب ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ربا در اصل (USURY) ہے اور (INTEREST) کا صحیح ترجمہ سود ہے جو جائز اور ناجائز دونوں ہو سکتے ہیں۔ جب ہم "بے سود" اور "سود مند" کے الفاظ بولتے ہیں۔ تو اس وقت "ربوا" کا کوئی مفہوم ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا۔ لیکن جب "سود خواری" کا لفظ ادا کرتے ہیں۔ تو اس سے مراد ربو اخوری ہوتی ہے۔ بالکل یہی شکل "انٹرسٹ" کی ہے اس کا ترجمہ سود کرنا تو غلط نہیں۔ لیکن چونکہ عام طور پر یہاں سود سے مراد ربوا ہی لی جاتی ہے۔ اس لئے "ربح" اور "منافع" کا کوئی مفہوم ذہن میں نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ کمرشل انٹرسٹ کا ترجمہ تجارتی سود کی بجائے تجارتی منافع یا ربح کرنا زیادہ درست ہے۔ کیونکہ ہماری فکرِ خام اسی نتیجے پر پہنچی ہے کہ کمرشل انٹرسٹ ربوا نہیں بلکہ ربح ہے اور اگر اس کے جواز کی کوئی دلیل کتاب و سنت میں نہیں ملتی تو عدمِ جواز کی دلیل بھی نہیں ملتی۔

اب رہا حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا دعوا الربوا والریبہ ربا کو بھی چھوڑ دو اور اس چیز کو بھی۔ جس میں اس کا شائبہ پیدا ہو، تو بلا شبہ یہ اعلیٰ مراتب تقویٰ ہیں اور ہمارا نصب العین بھی ہونا چاہیئے کہ معاشرے کو ایسے مقام پر پہنچایا جائے جہاں یہ

شبہ و شک والی بات بھی ختم ہو جائے۔ لیکن سوال یہ ہے۔ کہ مزدست اس جمہوری دور میں کیا کیا جائے اور کونسا طریقہ ہو جو معاشی کاروبار میں رکاوٹ نہ پیدا ہو؟ حضرت عمرؓ کے فرمان کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو اس کی لپیٹ میں صرف کمرشل انٹرسٹ ہی نہ آئے گا۔ بلکہ بے شمار چیزیں آئیں گی جن کا ذکر ہم اس وقت مناسب نہیں سمجھتے۔ بوقت ضرورت ہم ان حضرات سے دریافت کریں گے جو اپنا سارا زور کمرشل انٹرسٹ پر ہی دیتے ہیں اور زندگی کے بیشمار گوشوں میں صرف "ربیٰ" کو نہیں بلکہ "ادنی الربا" کو بخوشی گوارا کئے ہوئے ہیں مفتی کا کام محض یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ صرف فتویٰ دے کر الگ ہو جائے بلکہ مشکل کا حل اور غلط کا صحیح بدل بھی بتانا چاہیئے یہی ہے کتاب اللہ اور حکمت کا تقاضا۔

کمرشل انٹرسٹ کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کمرشل انٹرسٹ کیا چیز ہے اور اس کی ضرورت کیوں ہوتی ہے اور اس کا ثمرہ کیا ہے؟

بات یہ ہے کہ تجارت کے لئے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور بہت سے افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو تجارتی صلاحیت تو رکھتے ہیں مگر سرمایہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے تجارت نہیں کر سکتے، ان کو تجارتی مقاصد کے لئے بہرحال سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مطلوبہ سرمایہ اُسے قرض لینا پڑتا ہے اور کوئی شخص ایسا نہیں جو محض فی سبیل اللہ کسی کو غیر معین مدت کے لئے قرض دے دے۔ ہر انسان اپنا سرمایہ اُسی جگہ لگاتا ہے جہاں اُسے کچھ نفع

کی توقع ہو۔ اس نفع کی دو شکلیں ہیں:۔

(۱) منافعے میں اپنا حصّہ رسدی لگالے۔ مثلاً یہ طے کرے کہ جو منافع ہوگا۔ اس میں نصف یا تہائی وغیرہ ہمارا ہوگا۔ یعنی سرمایہ ہمارا اور محنت تمہاری، نفع میں دونوں شریک ۔ اسے فقہ میں مضاربت کہتے ہیں اور یہ فقہ اسلامی میں جائز ہے۔

آگے چلنے سے پہلے یہاں دو ضروری باتیں پیش نظر رکھیئے، ایک یہ کہ اس صورت میں سرمائے دار کوئی محنت نہیں کرتا، صرف سرمایہ لگاتا ہے۔ اس توقع پر کہ جسے سرمایہ دیا جا رہا ہے۔ اس کی دیانت، محنت اور حکمت، دینے والے کی نظروں میں قابل اعتماد ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں یہ بھی خطرہ ہوتا ہے کہ نفع نہ ہو یا اتنا نقصان ہو کہ راس المال کا کوئی حصّہ بھی واپس نہ ملے۔

(۲) دوسری شکل نفع کی یہ ہوتی ہے کہ ہم تمہیں اتنا روپیہ دیتے ہیں۔ لیکن نفع میں کوئی حصہ رسدی نہیں رکھتے بلکہ ایک مختصر سی معین رقم مقررہ میعاد پر لے لیا کریں گے مثلاً ایک یا دو فی صد۔ یہی کمرشل انٹرسٹ ہے۔

ربوا اور ربح کی مخلوط شکل

اس صورت نفع میں بھی چند باتیں پیش نظر رکھیئے:۔ دینے والا فرض کیجئے اگر دو ہزار روپیہ قرض دیتا ہے اور اس کے عوض ایک معین رقم مثلاً چالیس روپے ماہانہ (راس المال کے علاوہ) وصول کرتا ہے تو اس معین رقم کی شکل بالکل ربوا کی سی نظر آتی ہے۔ اسی لئے یہ مسئلہ زیر بحث آگیا ہے۔

ب - قرض لینے والا یہ چالیس روپے ماہانہ اپنی جیب سے نہیں دیتا، بلکہ وہ اس رقم قرض کو تجارت میں لگا کر مثلاً سو روپیہ ماہانہ کما لیتا ہے اور اسی نفع میں سے چالیس روپے دیتا ہے۔ گویا اس لحاظ سے اس کا چالیس فی صد منافع میں شریک ہونا بالکل مضاربت کی سی شکل ہوتی ہے۔ تجارتی اغراض کے لئے بنک اسی قسم کا قرض دیتے ہیں۔ نیز جو لوگ بنک میں اپنی رقم جمع کرا دیتے ہیں۔ اُن کی اس رقم سے بنک بھی تجارت ہی کرتا ہے اور اسی کے منافعے میں سے ایک معین رقم ادا کرتا ہے۔

ج - اس قرض میں بظاہر قرض دینے والا صرف منافعے میں شریک معلوم ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت معاملہ یوں ہوتا ہے کہ قرض لینے والا اپنے تجربے اور عقل سے اندازہ لگاتا ہے اور وہ بڑی حد تک درست ہی ہوتا ہے۔ کہ اس رقم کو تجارت میں لگانے کے بعد نفع و نقصان کو ملا کر بھی اتنی بچت ہوگی جس میں ہم قرض دینے والے کو اتنا دے دیں جب بھی ہمیں اتنا بچے گا۔ وہ اس رقم کو ایک مدتِ معینہ تک اُلٹ پھیر کرنے کی اسکیم بناتا ہے۔ اس میں وہ اپنے نقصان کا بھی پرسنٹیج نکال لیتا ہے اور فی صد نفع کا بھی اندازہ کر لیتا ہے، اس کے بعد وہ یہ طے کر لیتا ہے کہ اگر ہم کم از کم اتنا ماہانہ منافع دے دیا کریں گے تو ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوگا بلکہ پھر بھی ہم نفع ہی حاصل کریں گے۔ مثلاً نفع و نقصان نکال کر ہم دس فی صد منافعہ کما کر اس میں سے تین یا چار فیصد قرض دینے والے کو ادا کر دیا کریں گے۔

یہ صورت حال ایسی ہے کہ اگرچہ بہ ظاہر قرض دینے والے کو صرف

منافعہ حاصل ہوتا ہے۔ لیکن دراصل وہ اس نقصان میں بھی شریک ہوتا ہے۔ جو قرض لینے والا کاروباری شخص دورانِ تجارت ہیں اٹھاتا رہتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ منافعہ تو اسے نظر آجاتا ہے مگر نقصان نظر نہیں آتا۔ اسے جو کچھ منافعہ ملتا ہے وہ دراصل نفع و نقصان دونوں سے چھَن کر آتا ہے۔ لہٰذا ظاہری صورت صرف منافعے کی نظر آتی ہے۔ اس لئے یہ ربوا دکھائی دیتا ہے لیکن دراصل وہ نفع و نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے اور اس لحاظ سے یہ مضاربت ہی کی ایک شکل ہے۔ اس تجارتی منافعے اور مضاربت کے منافعے میں صرف اسی قدر فرق ہے کہ مضاربت میں حصّہ رسدی منافعے میں ہوتا ہے جو غیر معین ہے اور کمرشل انٹرسٹ میں نفع معین ہوتا ہے۔ قرض لینے والا اُس میں بھی کماتا ہے اور اس میں بھی۔ قرض دینے والا وہاں بھی منافعے میں شریک ہوتا ہے اور یہاں بھی۔

دونوں کا تشابہ اور تباین

اب ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ کہ کمرشل انٹرسٹ مضاربت بھی ہے اور ربوا بھی۔ یا یوں کہیئے کہ دونوں میں سے کوئی بھی نہیں۔ ایک لحاظ سے یہ مضاربت بھی ہے اور دوسرے لحاظ سے ربوا بھی۔ ربوا اِس لئے کہ اس میں ربوا ہی کی طرح منافعے کی رقم معین ہے جو بہر حال قرض لینے والا ادا کرتا ہے اور مضاربت اس لئے کہ جس طرح قرض لینے والا اپنے منافعے کا ایک حصّہ قرض دینے والے کو دیتا ہے اسی طرح یہاں بھی اپنے منافعے ہی میں سے ایک معیّن حصّہ ادا کرتا ہے۔

یا یوں کہیئے کہ یہ مضاربت نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں حِصّۂ رسدی کے مطابق

شرکت نہیں ہوتی بلکہ معین رقم سے ہوتی ہے اور یہ ربوا بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں منافع لینے والے کا ایک طرفہ منافع نہیں ہوتا۔

سلبی و ایجابی پہلو

اگر ہم کمرشل انٹرسٹ کو جائز قرار دیں۔ تو اس کے لئے یہ ثابت کرنا ضروری نہیں کہ یہ سو فیصد مضاربت ہے۔ بلکہ اس کے لئے صرف اسی قدر ثابت ہونا کافی ہے کہ یہ ربوا نہیں ہے۔ لین دین میں حلت کے لئے مضاربت ہونا ضروری نہیں بلکہ یہاں ربوا (یا دوسری حرام شکلیں) نہ ہونا ہی عدم حرمت کے لئے کافی ہے۔ یہ عدم حرمت ایک سلبی پہلو ہے ...... لیکن ہم اگر ذرا اور آگے بڑھیں تو ایک ایجابی پہلو بھی اس میں موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ ربوا لینے والے اور کمرشل انٹرسٹ لینے والے کے ذہنی رجحان میں اور اس کے نتائج میں بھی بڑا فرق ہے ..... ربوا خوار ضرورت مند کی مجبوری سے اپنا فائدہ اٹھاتا ہے اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ قرض لینے والے کا کیا حال ہوتا ہے بلکہ عموماً وہ اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ قرض لینے والا قرض ادا کرنے کے قابل ہی نہ ہو سکے اور سود کی رقم اتنی بڑھ جائے۔ کہ آخر کار اس کی تمام جائداد کو قرق کرا کے یہ اس پر قبضہ کر لے۔ لیکن تجارت کے لئے جو قرض لیا جاتا ہے۔ اس میں یہ رجحان نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہاں قرض لینے والے کا بھی اسی میں فائدہ ہے کہ قرض لینے والا تجارت میں کامیاب ہوتا رہے اور نتیجہ بھی ہمارے سامنے ہے کہ آج دنیا کا سارا کاروبار اسی طرح

چل رہا ہے۔

قابلِ غور مثال

اس سلسلے میں چند مثالوں پر غور کرنا بھی ہمیں نفسِ مسئلہ سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ فرض کیجئے، ایک شخص آٹھ سو روپے کی ایک بھینس خریدتا ہے جو روزانہ دس پندرہ سیر دودھ، دیتی ہے۔ یہ اپنی بھینس ایک شخص کو اس شرط پر دیتا ہے کہ تم اس کی خدمت کرو اور اس کے دودھ، دہی گھی مکھن سے فائدہ اٹھاؤ اور مجھے چار یا پانچ سیر دودھ روزانہ دے دیا کرو۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس قسم کی شرائط پر وہ بھینس کسی کے حوالے کرے اور وہ اِن شرائط کو قبول کرلے تو کیا یہ سودا کسی فقہ کی رُو سے ناجائز ہوگا؟

دوسری مثال

ایک اور رائج الوقت مثال بھی لیجئے۔ ایک شخص کئی عدد رکشا یا تانگہ گھوڑا لوگوں کو اس شرط پر دیتا ہے کہ تم مجھے اتنی رقم روزانہ دیدیا کرو۔ سوال یہ ہے کیا یہ سودا حرام ہے؟

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ دونوں قسم کے سودے جواز کی حد میں آتے ہیں۔ مالک یہ سوچتا ہے کہ میرے پاس اس کی خدمت کے لئے یا روزانہ کے حساب کتاب کے لئے وقت نہیں۔ اس لئے وہ دُودھ یا رقم کی ایک مقدار پر قانع ہو جاتا ہے اور سودا کرنے والا یہ دیکھتا ہے کہ بھینس یا رکشا خریدنے کے لئے ہمارے پاس سرمایہ نہیں۔ اگر کسی سے ہم یہ بھینس یا رکشا لے لیں تو نفع نقصان کو نکالنے کے بعد بھی ہماری اوسط بچت اتنی ہوگی۔ اس میں سے اگر ہم مالک کو اتنا دیدیں

جب بھی ہمیں اتنا کچھ بچ رہے گا۔ غرض اس میں معاملہ کرنے والے دونوں فریقوں کا فائدہ متوقع ہے۔ اس لئے اس میں عدم جواز کا پہلو تلاش کرنا کچھ درست نہیں اب خوب غور سے دیکھئے۔ کیا کمرشل انٹرسٹ کی بالکل یہی شکل نہیں ؟

قابلِ لحاظ اور ضروری باتیں

ہاں اس قسم کے سودے میں بھی عدم جواز کے پہلو نکل سکتے ہیں اور اُن سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ جب اس قسم کا معاملہ ہو تو :-

(الف) شرائط ایسی نہ رکھی جائیں۔ جن کے نتیجے میں یکطرفہ منافعہ ہو یا ایک فریق اتنا زیادہ نفع لے کہ دوسرے فریق کے لئے زندہ رہنا دشوار ہو جائے۔

(ب) ناگہانی آفات کے لئے بھی — بشرطیکہ تعمُّد نہ ثابت ہو — رعائتیں موجود ہوں۔ خواہ خود مالک دے یا کوئی سوسائٹی یا حکومت۔

(ج) مفت خوری کا جذبہ یا امکان کم سے کم کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔

ایک سوال کا جواب

یہاں "مفت خوری" کے سلسلے میں بھی یہ سُن لینا چاہیئے کہ کمرشل انٹرسٹ میں بلا شبہ مفت خوری کا شائبہ موجود ہے۔ محنت کرنے والا تو اپنی محنت کا ثمرہ لیتا ہے۔ مگر سرمائے دار محض اپنے سرمائے کا منافعہ بغیر کسی محنت کے وصول کر کے مفت خوری کرتا ہے جسے یقیناً اِسلام پسند نہیں کرتا۔ لیکن اس کے دوسرے پہلوؤں پر بھی غور کرنا چاہیئے۔

اوّلاً یہ کہ کیا یہی صورت کرایہ مکان لینے میں نہیں ہوتی؟ کیا اس سے کہیں بڑھ کر ظالمانہ حد تک مفت خوری جاگیرداری میں موجود نہیں؟ اور کیا مضاربت کی بھی بالکل یہی شکل نہیں جسے سارے فقہاء جائز بتاتے ہیں؟

ثانیاً کیا دولت کو جمع رکھنا اور اُسے گروش نہ دینا بجائے خود ایک بہت بڑی معصیت نہیں؟ اب دیکھیے۔ سرمایہ دار کے سامنے دو راستے ہیں یا تو وہ اپنا سرمایہ بند رکھے، جس میں نہ اس کا فائدہ ہے اور نہ دوسروں کا۔ یا اسے تجارتی منافعے کی شرط پر کسی کو دیدے۔ جس میں اگرچہ مفت خوری کا شائبہ تو پایا جاتا ہے لیکن دولت گردش میں رہتی ہے اور نفع دونوں فریقوں کا متوقع ہے خود سوچ لیجیے کہ ان دونوں راستوں میں کونسا بہتر ہے۔ اکتناز بے نفع یا نفع رساں مفت خوری؟

ایک شُبہے کا ازالہ

ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اپنا سرمایہ وہ خود ہی کیوں نہیں لگاتا؟ لیکن اسے نہ بھولنا چاہیئے۔ کہ

(الف) اس میں ایک ہی فریق کا فائدہ ہے اور یہاں یہ زیر بحث بھی نہیں۔

(ب) ہر سرمایہ دار اس کی اہلیت یا وقت نہیں رکھتا اور ہر ناتجربہ کار یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ وہ اپنی سلامتی اسی میں سمجھتا ہے کہ وہ اپنا سرمایہ کسی معتبر تجربہ کار کے حوالے کر کے اس کے نفع میں خود شریک ہو جائے یہ نفع اگرچہ معین ہوتا ہے لیکن اس تعین کو وہ مقروض اپنے تمام نفع نقصان

کی اوسط کا اندازہ کر کے قبول کر لیتا ہے

ایسی حالت میں یہ نفع بخش مفت خوری ناروا ہونے کے باوجود اس اکتناز سے بہر حال بہتر ہے، جس میں کسی کا نفع نہیں۔

بیع سلم سے مماثلت ایک اور چیز پر بھی غور فرمایئے۔ بیع سَلَم۔ فقہائے کرام کے نزدیک جائز ہے۔ یہ ہے کیا چیز؟ اسے بھی سُنیئے:

وھوان یعطی ذھبًا او فضۃً فی سلعۃ معلومۃ الی امد معلوم بزیادۃ فی السعر الموجود عند السلف (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۲ صفحہ ۳۰۱)

بیع سلم کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کسی کو ایک معین مدت تک کے لئے سونا یا چاندی کسی ایسے متعین سودے کے لئے دے جس کا نرخ قرض دیتے وقت کے نرخ سے زیادہ ہو۔

ترجمے سے شاید پوری بات واضح نہ ہو سکی ہو۔ اس لئے یوں سمجھئے کہ زید خالد کو نوّے روپے قرض دیتا ہے۔ اُس وقت گندم کا بھاؤ پندرہ روپے من ہے۔ جس کے لحاظ سے نوّے روپے کے چھ من ہوتے ہیں۔ لیکن زید اسے اس شرط پر رقم دیتا ہے کہ میں اتنی مدت کے بعد تم سے نو من گندم یعنی دس روپے من کے حساب سے لوں گا۔ یہ معاملہ عموماً کاشتکار وغیرہ کرتے ہیں۔

ان کو یہ توقع ہوتی ہے کہ اس رقم قرض کے عوض اگرچہ تین من مزید گندم دینے سے ہمیں بینتالیس روپے کا خسارہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ لیکن پیداوار اتنی ہوگی کہ اس نقصان کے باوجود ہمیں سو روپے مل جائیں گے۔ اسی طرح سرمایہ دار کو یہ نظر آتا ہے کہ اس وقت ہم قرض دیتے ہیں۔ تو اتنے دنوں کے بعد ہمیں پندرہ کی بجائے دس ہی روپے من گندم مل جائے گا اور اس طرح بینتالیس روپے کا فائدہ رہے گا۔ یہ ہے بیع سَلَم اور یہ فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔ اور نظر بظاہر اس میں کوئی مضائقہ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اس میں دونوں کا فائدہ ہے اور اس کی شکل نتیجے کے اعتبار سے تقریباً مضاربت ہی جیسی ہوتی ہے ؛

اب سوال یہ ہے کہ مآل کے اعتبار سے بیع سَلَم اور کمرشل انٹرسٹ میں کیا فرق ہے؟ دونوں نسیئہ (اُدھار) ہیں۔ دونوں میں قرض دینے والا اپنے نفع کی مقدار مقرر کر دیتا ہے۔ دونوں میں طرفین خوشی سے سودا کرتے ہیں۔ دونوں میں قرض لینے والا اپنے نفع نقصان کا اندازہ کر کے یہ دیکھ لیتا ہے کہ کچھ زائد واپس کر کے بھی مجھے کچھ بچ رہے گا۔ دونوں میں یک طرفہ نفع کا فقدان ہے۔ اور دونوں میں فریقین کو بیع کی طرح اپنا نفع نظر آتا ہے۔

فرق بہت ہلکا ہے

اگر بیع سَلَم اور کمرشل انٹرسٹ میں کوئی فرق ہے تو صرف اسی قدر ہے کہ کمرشل انٹرسٹ میں قرض

دینے والا راس المال سے زائد رقم وصول کرتا ہے اور بیع سلم میں راس المال کی قیمت کے گندم سے زیادہ رقم کا گندم حاصل کرتا ہے۔

اب سوال یہ کہ ان دونوں نفعوں میں لفظی فرق کے سوا اور کیا ہے؟ یہ عدل کی کونسی قسم ہے کہ دس روپے کی بجائے بارہ روپے لو تو ناجائز ہو اور بارہ روپے کا گندم لے لو بالکل جائز ٹھہرے؟ کیا نفع اندوزی کی سپرٹ دونوں میں یکساں موجود نہیں؟ فقہ کا مطلب ہرگز لفظی ہیر پھیر نہیں۔ نظر ہمیشہ سپرٹ پر رکھنی چاہیئے۔

دو ہم شکل استفتوں کے مختلف جواب

آپ ذرا اہل علم کے سامنے دو استفتے رکھیے:

(۱) ایک شخص کسی کو ایک ٹیکسی خرید کر دیتا ہے کہ تم اسے چلاؤ اور اسے جس طرح مناسب سمجھو اچھی طرح استعمال کر کے جتنا چاہو کماؤ اور مجھے ہر روز دس روپے دے دیا کرو۔ یہ سودا جائز ہوگا یا نہیں؟

(۲) ایک شخص کسی کو بیس ہزار روپے دیتا ہے کہ تم اس سے ٹیکسی خرید کر چلاؤ اور مجھے دس روپے روز دے دیا کرو۔ یہ سودا جائز ہے یا نہیں؟

آپ یہ دونوں استفتے الگ الگ اوقات میں اہل علم سے دریافت کر کے دیکھیے آپ دیکھیں گے کہ بیشتر حضرات اول الذکر کو جائز اور ثانی الذکر کو ناجائز بتائیں گے۔ اس وقت انہی سے دریافت کیجئے کہ ان دونوں سودوں میں فرق پیدا کرنے والی کیا چیز ہے؟

ہمارے نزدیک دونوں ہی بیع ہیں۔ اگر جائز ہیں تو دونوں ہی جائز ہیں اور ناجائز ہیں۔ تو دونوں ہی ناجائز ہیں۔ کیونکہ فرق صرف لفظی ہے۔ معنًی کوئی

فرق نہیں۔

بزنس کا سائنٹیفک انداز

ایک اور بات بھی سُن لیجیے۔ کہ زمانہ اپنی بہت سی باتوں میں اتنا آگے جا چکا ہے کہ پہلے اس کا تصور کرنا بھی مشکل تھا۔ اب سائنٹیفک اور اٹامک دور ہے اور اس نے زندگی کے بیشمار معاملات کو کچھ ایسا سائنٹیفک سا بنا دیا ہے کہ اس کا نتیجہ بھی تقریباً دو اور دو چار کی طرح یقینی ہو گیا ہے۔ اب اونچی سطح کی جو تجارت ہوتی ہے وہ اٹکل پچو اور اندھے کی لکڑی نہیں ہے۔ کہ ادھر مال روانہ اور اُدھر فکر دور کرنے کے لئے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ کہ خدا جانے ہمارا مال پہنچے گا یا نہیں اور اگر پہنچا تو نکاسی ہوگی یا نہیں۔ اب تو بزنس کا انداز یہ ہے کہ دس ہزار میل سے تار آ گیا یا ٹرنک کال آگئی کہ پچاس لاکھ کا فلاں مال بھیج دو۔ ادھر وہ مال پہنچا بھی نہیں اور اُدھر خریداروں نے اپنے اپنے نام رجسٹرڈ کرا دئے۔ گویا سودا ہو گیا اور بینک کے توسط سے دام بھی ادا ہو گئے۔ پھر مال کے روانہ ہونے کے بعد یہ اندیشہ بھی نہیں ہوتا کہ مال ضائع ہو جائے گا۔ کیونکہ اوّلاً تو طوفان حوادث پر بڑی حد تک قابو پا لیا گیا ہے۔ اور ان کا پہلے سے علم ہو جاتا ہے اور دوسرے سارا مال ضائع بھی ہو جائے۔ تو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ انشورڈ ہوتا ہے اور پورا معاوضہ مل جاتا ہے۔ واضح رہے کہ ہم صرف واقعہ بیان کر رہے ہیں۔ انشورنس کے جواز یا عدم جواز پر بحث نہیں کر رہے ہیں۔ ہم انشاء اللہ کسی دوسری صحبت میں اس

پر بھی گفتگو کریں گے۔)

غرض موجودہ دور کی بزنس اندھے کی لکڑی نہیں۔ جس میں اندیشہ ہو کہ کمرشل انٹرسٹ لینے والا تو اپنی رقم لیتا جائے گا۔ خواہ قرض کی رقم لینے والا نقصان ہی کیوں نہ اُٹھاتا رہے۔ لہٰذا یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اگر کوئی شخص یا گروپ قرض لے کر کمرشل انٹرسٹ ادا کرتا ہے تو وہ "کل کچھ تجارت نہیں کرتا بلکہ وہ سائنٹیفک انداز کی تجارت ہوتی ہے اور وہ نفع و نقصان کا نوّے فیصد صحیح اندازہ کر کے اپنے منافعے کا ایک حصّہ قرض دینے والے کو ادا کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا حصّہ رسدی منافعے میں نہیں لگاتا۔ بلکہ رقم قرض پر پرسینٹیج لگاتا ہے۔

بینک فیل بھی ہو جاتے ہیں۔ بزنس میں نقصان بھی ہوتے ہیں۔ لیکن چند فیصد واقعات پر کسی کلیئے کی عمارت نہیں کھڑی کی جا سکتی۔ ریلیں اُلٹتی ہیں۔ طیارے گرتے ہیں۔ موٹریں ٹکراتی ہیں۔ لیکن اِن باتوں سے یہ کاروبار ختم نہیں کر دیئے جاتے۔ فتویٰ غالب حیثیت پر دیا جاتا ہے نہ کہ شاذ پر۔

ایک قابلِ غور آیت موجودہ کاروبار میں بہت جگہ ظلم اور عزباکشی بھی ہوتی ہو گی۔ اِس سے ہمیں انکار نہیں بلکہ ہم اِن کو دُور کرنا اہم فرائض میں سمجھتے ہیں۔ اِس وقت تو ہم صرف اس کی عمومی حیثیت پر گفتگو کر رہے ہیں۔ جہاں تک "اکل بالباطل" کا تعلق ہے وہ صرف موجودہ

بزنس ہی میں نہیں ـ زندگی کے دوسرے گوشوں میں بھی موجود ہے اور شدید تر ہے۔
اس سلسلے میں قرآن کریم کی یہ آیت بہت غور طلب ہے۔

یاایھا الذین امنو لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل ان
تکون تجارۃ عن تراض منکم (۴: ۲۹)

ایمان والو آپس میں اپنے مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ۔ بجز اس کے
کہ تمہاری باہمی رضامندی سے تجارتی معاملہ ہو۔

ہماری دانست میں یہ اِلّا جس مقصد کے لئے آیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے ۔یہاں اکل بالباطل کی ممانعت ...... تجارت ہی کے تمام طریقوں سے متعلق ہے مطلب یہ کہ تجارت کے جن جن طریقوں میں اکل بالباطل ہے وہ سب حرام ہیں، ظاہر ہے کہ جہاں اکل باطل ہوگا وہاں ایک فریق کی عدم رضا ضرور ہو گی۔ اکل باطل میں کھانے والا تو راضی ہوتا ہے۔ لیکن جسے کھایا جاتا ہے وہ کبھی راضی نہیں ہوتا۔ وہ اسے صرف اپنی مجبوری سے برداشت کرتا ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی ایسی تجارت ہو۔ جس میں دونوں فریق کی رضامندی اور خوش دلی ہو تو وہ یقیناً اکل بالباطل نہ ہوگا۔ اب ذرا ٹھنڈے دل سے اسی عینک سے کمرشل انٹرسٹ کو دیکھئے۔ کیا اس میں قرض لینے والا اسی طرح مجبور و مظلوم ہوتا ہے جس طرح صرفی اور حاجتمندانہ ضروریات کے لئے قرض لینے والا ہوتا ہے؟ اور کیا وہ قرض دینے والے

کے نفع سے سود خوار کے یک طرفہ نفع کی طرح ناخوش ہوتا ہے؟۔

جو ربا حرام ہے وہ وُہی ہے۔ جس میں صرف ایک فریق کا خود غرضانہ نفع اور دوسرے کا نقصان ہے۔ کمرشل انٹرسٹ پر جو تجارت کی جاتی ہے۔ اس میں دونوں فریق کی باہمی رضامندی و خوش دلی ہوتی ہے اور اُن کا ربار کی ترقی سے دونوں کی خوش حالی وابستہ ہوتی ہے اور اس صورتحال کو الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم میں داخل کرنے میں کوئی شرعی قباحت نظر نہیں آتی۔ آگے یہ روائت آئے گی۔ کہ خود حضورؐ نے اور بعض صحابہؓ نے تفاضل کے ساتھ قرض واپس کیا ہے۔ اور یہ اس لئے روا ہے۔ کہ اس میں خوش دلی موجود ہے۔

ایک قابلِ غور فتوٰی

آخر میں ہم مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور مولانا ارشاد حسین رامپوری کا ایک فتوٰی درج کرتے ہیں۔ ذرا اس پر بھی غور فرمایئے۔ لکھتے ہیں۔ کہ

اگر خریدار بصورت خرید نقد ایک مال کو سَو روپے میں خریدتا ہے اور اُدھار کی شکل میں مدت ایک ماہ کے بعد ایک سو تین روپے۔ دو ماہ کے بعد ایک سو چھ۔ تین ماہ کے بعد ایک سَو نو روپے ادا کرتا ہے تو جائز ہے اور ہر ماہ تین روپے زیادت

میں کوئی قباحت نہیں۔ اسی طرح ایک تھان کپڑا دے کر اسی حیثیت کے دو تھان لینا دست بہ دست ہو یا ادھار دونوں جائز ہیں۔ کیونکہ .....

ہم نے "کیونکہ" لکھ کر آگے لکھنا مناسب نہ سمجھا، کیونکہ اس سے فقہی حیلوں اور فقیہانہ موشگافیوں کا عجیب نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ جس میں لفظ تو دیکھے جاتے ہیں اور روح غائب ہو جاتی ہے۔ بہرحال چونکہ اس "کیونکہ" کے بغیر عبارت پوری نہیں ہو سکتی اس لئے اسے بھی ملاحظہ فرمالیجئے:۔

کیونکہ جنسیت کے باوجود کیل ناپ یا وزن سے اس کی خرید فروخت نہیں ہوتی۔ (فتاوی مولانا عبدالحی صد ۱۰۰)

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ اگر کوئی شخص ردّی چاندی دے کر اس سے کم وزن کی اعلیٰ چاندی لے لے تو یہ ربوا ہے، کیونکہ وزن میں کمی بیشی ہوگئی، اور اگر ایک تھان دے کر ویسے ہی دو تھان لے لے تو یہ ربوا نہیں — خواہ نقد ہو خواہ ادھار — کیونکہ کپڑا نہ تولا جاتا ہے، نہ مُد اور صاع سے ناپا[1] جاتا ہے، پھر اگر سو روپے کا مال لے کر ہر ماہ تین روپے (سود) دیتا رہے تو وہ بھی ربوا نہیں، کیونکہ مال اور روپیہ ہم جنس نہیں، لیکن اگر سو روپے کا مال لے کر دیا ہی ایک سو تین روپے کا

---

[1] حالانکہ ناپ میں مُد اور صاع کے پیمانے ہی نہیں، گز وغیرہ بھی ناپ ہی میں داخل ہیں۔

مال واپس کرے تو حرام اور ربوا ہو جائے گا۔ کیونکہ دونوں کی جنس ایک ہی ہے یہ فقہی منطق ہماری سمجھ میں کبھی نہ آسکی، بہر حال ہمیں سر دست اس "کیونکہ" پر گفتگو نہیں کرنی ہے، کہنا صرف یہ ہے کہ اگر بینک کی وساطت سے ایک لاکھ روپے کا مال اُدھار منگوا لیا جائے۔ جیسا کہ آج کل کی تجارت میں رواج ہے تو کچھ ماہانہ رقم جو راس المال سے زیادہ ہے ادا کرنے میں کونسی شرعی قباحت لازم آتی ہے بخصوصاً مذکورۂ بالا فتوے کی روشنی میں؟ اور پھر اگر اسی بینک کے توسط سے مال نہ منگوایا جائے۔ بلکہ ایک لاکھ روپیہ ہی لے کر تجارت میں لگا دیا جائے اور اسی شرح سے کچھ ماہانہ رقم (راس المال کے علاوہ) ادا کی جائے تو دونوں صورتوں میں وہ کونسا فرق ہے کہ پہلی شکل تو فتوائے مذکور کے مطابق جائز ٹھہرے اور دوسری صورت ناجائز قرار پائے۔ اس میں وہ کون سا مخصوص قسم کا ممنوعہ ظلم ہے جو اُس میں نہیں ہے؟

اکتناز انفاق کی ضد ہے

اسلام دَولت کا اکتناز ہرگز پسند نہیں کرتا اس کے لئے یہ وعید ہے کہ:

والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔

جو لوگ سونا چاندی کو جمع رکھتے ہیں اور راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو۔

جمع مالا وعدده۔ جو دولت جمع کر کے اسے گنتا رہتا ہے اس کے لئے بربادی ہے۔)

یہاں آگے چلنے سے پہلے انفاق فی سبیل اللہ کا مطلب خوب سمجھ لینا چاہیئے۔ اس کا مطلب خیرات دینا نہیں۔ بلکہ ہر جائز ضرورت پر خرچ کرنا ہے، خواہ اپنی ذاتی ضرورت ہو یا اپنے اہل وعیال کی یا عام انسانوں کی۔ یہ ضرورت خواہ مادی ہو یا روحانی سب ہی اسی میں شامل ہیں۔ انفاق ضد ہے اکتناز (HOARDING) کی۔ مکتنز اپنی دولت سے خود فائدہ اٹھاتا ہے نہ دوسروں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دیتا ہے۔ وہ صرف مال خزانہ بنا بیٹھا رہتا ہے اور خدا انفاق چاہتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ دولت گردش میں رہے اور گردش بھی ایسی ہو کہ ایک طبقے میں محدود ہو کر نہ رہ جائے۔

کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم

تاکہ صرف تمہارے دولتمندوں ہی میں گردش نہ کرتی پھرے (جس سے عوام کو کوئی فائدہ نہیں)

چونکہ اس گردش عام میں سب کا فائدہ ہے۔ اس لئے خدا انفاق چاہتا ہے اور انفاق ہی کو باقی رکھنے کے لئے اس نے اکتناز کی ساری شکلوں کو ممنوع اور مستحق عذاب قرار دیا ہے۔

انفاق کے لئے آمد اور اس کی شکلیں۔ انفاق جیسی محبوب شے اس وقت

تک جاری نہیں رہ سکتی جب تک کسی طرف سے آمد بھی نہ ہو۔ اگر آمد بھی نہ ہو تو انفاق ایک ہی بار یا ایک محدود وقت تک باقی رہ سکتا ہے۔ اس لئے انفاق کے لئے آمد بھی ضروری ہے۔

- آمد کی دو ہی شکلیں ہیں، ایک شکل یہ ہے کہ دوسروں کو نقصان پہنچا کر آمد کی صورت پیدا کی جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کو فائدہ پہنچا کر یا کم از کم کسی کو نقصان پہنچائے بغیر ہی آمدن کی شکل اختیار کی جائے، پہلی شکل میں انسانیت کا خون ہے اور دوسری صورت میں انسانیت کا بھلا ہے۔ لہٰذا اسلام نے پہلی صورت کی تمام قسموں کو ممنوع قرار دیا ہے۔ چوری، ڈاکہ، دھوکہ، استحصال واستغلال (EXPLOITATION) کی وہ ساری شکلیں، جن میں کسی ایک فریق پر ظلم ہو، اسلام نے ناجائز قرار دی ہیں۔

ربوا کی حقیقت

اسی ظالمانہ استحصال کی ایک شکل "ربوا" بھی ہے۔ حرام صرف ربوا نہیں بلکہ استحصال کی جتنی شکلیں ہیں وہ سب حرام ہیں اور وہ بھی کسی نہ کسی طرح ربوا ہی میں داخل ہیں۔

ربوا صرف دس دے کر گیارہ لینے کو نہیں کہتے۔ یہ فعل اس وقت ہوتا ہے، جب اس کے اندر خوش دلی نہ ہو بلکہ جابرانہ دباؤ ہو۔ انسانی ہمدردی و مروّت کا جذبہ نہ ہو۔ بلکہ دوسروں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جائے۔ مختصر لفظوں میں یوں سمجھئے کہ جب تک ظلم کا پہلو موجود نہ ہو

اس وقت تک محض کمی بیشی کے فرق کو ربوا نہیں کہا جائے گا۔ اس کی مثال میں مندرجہ ذیل روایات پر غور کیجئے (یہ سب روایات پچھلے مضمون میں گزر چکی ہیں)۔

(۱) حضرت علیؓ نے اپنا ایک جمل (اونٹ عصیفر نامی) بیس بعیر (چار سال سے نو سال تک کے اونٹ) کے عوض فروخت کیا ہے اور وہ بھی اُدھار (رواہ مالک عن علیؓ)

(۲) عبداللہ عمرؓ نے خراب دراہم قرض لے کر اچھے دراہم واپس کئے اور فرمایا کہ یہ خوش دلی سے دے رہا ہوں۔ (رواہ مالک)

(۳) حضورؐ نے خود عبداللہ بن عباسؓ سے قرض لے کر زیادہ واپس کیا۔ (رواہ ابوداؤد)

(۴) حضورؐ نے فرمایا "خیارکم محاسنکم قضاءً" بہتر طریقے پر قرض ادا کرنے والے زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔ (اس میں زیادہ واپس دینے کی ترغیب ہے (رواہ عن ابی ہریرہؓ)

اگر ربوا یہ ہوتا کہ لینے اور دینے میں برابر کا معاملہ نہیں ہے تو ان ساری روایات میں حضورؐ کا اور صحابہؓ کا عمل نعوذ باللہ ربا کا کاروبار ہی ٹھہرے گا۔ پھر اس سے آگے دیکھئے۔ بعض اوقات لین دین اگرچہ دیکھنے میں برابر برابر کا معاملہ دکھائی دیتا ہے لیکن وہ کسی خارجی ظالمانہ انداز کی وجہ

سے ربوا میں داخل ہوجاتا ہے۔ مثلاً دس سیر معمولی گندم دے کر دس ہی سیر اعلیٰ گندم لینا اگرچہ بظاہر اپنے اندر کمی بیشی کا فرق نہیں رکھتا۔ لیکن اگر اس پر کوئی مجبور کیا جائے تو یہ یقیناً ربوا ہی کی ایک شکل ہوگی۔ اور اگر میاں خوش دلی ہو تو اُوپر کی روایات کے مطابق یہ ربوا نہ ہوگا۔ کیونکہ کسی شے کو ربوا بنانے والی چیز استحصال بالجبر، ظلم، خود غرضانہ نفع اندوزی اور دوسروں کی مجبوری سے بے پروائی وغیرہ ہے نہ کہ کمی بیشی کا فرق۔

غرض آمدنی کی وہ ساری شکلیں ممنوع کر دی گئی ہیں جن میں ظلم ہو یا کسی کو نقصان پہنچے اور جس طریقے میں اپنی آمدنی دوسروں کو فائدہ پہنچا کر یا کم از کم دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر ہو اس کی شکل صرف بیع یعنی تجارت ہے۔

تجارت کے علاوہ بھی آمدنی کی دوسری شکلیں ہیں۔ لیکن وہ بھی دراصل کسی نہ کسی صورت میں تجارت ہی ہوتی ہیں۔ ملازمت بھی اپنی صلاحیتوں کی تجارت ہے کہنا یہ ہے کہ تجارت ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو دونوں فریقوں کو نفع پہنچاتا ہے۔ دوسرے ذرائع آمدنی اتنے ہمہ گیر نہیں اسی لئے ارشاد ہوا ہے کہ:۔

ان تسعۃ اعشار رزقکم فی التجارۃ۔ رزق کے دس مرحصوں میں سے نو تجارت سے متعلق ہیں۔

خلاصہ خلاصہ یہ نکلا کہ اکتناز ضد ہے انفاق کی اور خدا انفاق چاہتا ہے اور اکتناز نہیں چاہتا۔ نیز یہ بھی مسلّم ہے کہ انفاق بغیر آمد

کے جاری نہیں رہ سکتا۔ اور آمد کے دو ہی ذرائع ہیں۔ ایک بیع جس میں فریقین کا نفع ہے اور دوسرے ربوا (تمام قسم کے استحصال) جس میں ایک ہی فریق کا خود غرضانہ نفع ہے اور دوسرے کا نقصان اور ظلم۔ یہ دونوں۔ بیع اور ربا ۔۔۔ ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔

حرمتِ ربوا کی علت ربوا کو حرام قرار دیتے ہوئے اس کی حرمت کی اصل علت خدا نے یوں بیان فرما دی ہے کہ :۔

لا تظلمون ولا تظلمون (نہ ظالم بنو نہ مظلوم) یعنی ربوا ہر وہ کاروبار ہے، جس میں کوئی فریق ظالم یا مظلوم ہو جائے، جب ایک فریق ظالم ہوگا، تو دوسرا خود بخود مظلوم ہو جائے گا۔ ان دو لفظوں میں ربوا کی ساری کائنات سمٹ کر آگئی ہے اور یہی مضمون حدیث میں لا ضرر ولا ضرار کے دو لفظوں میں بیان گیا ہے یعنی نہ نقصان پہنچایا جائے نہ نقصان اٹھایا جائے۔ پس جہاں دونوں فریقوں کا فائدہ ہو وہ بیع ہے اور جہاں صرف ایک فریق کا فائدہ اور دوسرے کا نقصان ہو وہ ربوا ہے۔ اگر کسی جگہ بیع اور ربوا کے دونوں پہلو پائے جاتے ہوں تو غالب پہلو کے مطابق ہی حکم لگایا جائے گا۔

فتویٰ صرف لفظ پہ نہیں محض بیع یا تجارت کا لفظ آجانے سے ہر بیع حلال نہیں ہو جاتی۔ اگر اس میں استحصال کی صورت

موجود ہو تو خواہ اِسے تجارت ہی کہا جائے لیکن وہ ناجائز ہوگی۔ مثلاً بیع غُرر (ایسی چیز کی تجارت جو اپنے قبضے ہی میں نہ ہو۔ مثلاً اُڑتے ہوئے پرندے کا سودا) بیع بالقاء الحجر (پتھر پھینک کر سودا کرنا) بیع ملامسہ (چھو کر سودا کرنا) غرض اٹکل پچو جتنی بیع ہے اور جن میں ایک فریق کے نقصان کا اندیشہ ہے وہ سب ناجائز ہے۔ حالانکہ بیع کا لفظ سب میں لگا ہوا ہے۔ اسی طرح بیع بالحصاۃ۔ بیع مزابنہ اور بیع محاقلہ بھی ہیں پس جس طرح "بیع" کا لفظ آجانے سے ہر بیع حلال نہیں ہو جاتی اسی طرح "سود" کا لفظ آجانے سے ہر سُود حرام نہیں ہو جاتا۔ اگر سود خواری ہے تو حرام ہے اور سود مندی ہے تو حلال ہے۔

اِسی طرح کوئی کاروبار محض اس لئے حرام نہیں ہوگا کہ اس طریقۂ کاربار کے ترجمے میں لفظ "سُود" آگیا ہے۔ کسی کاربار کا شمار ربوا میں اُسی وقت ہوگا جب ربوا کی اسپرٹ اس میں موجود ہو۔ جسے خدا نے لاتظلمون ولا تظلمون اور رسولؐ نے لاضرر ولا ضرار فرما کر واضح کر دیا ہے۔

یہ دلیل وزنی نہیں اِسی لئے کمرشل انٹرسٹ کے جواز کے لئے یہ دلیل[۱] چنداں وزنی نہیں کہ چونکہ عہدِ نبوّت میں اس کا رواج ہی نہ تھا۔ اور دسویں صدی کے پہلے اس کا کوئی وجود نہ تھا۔ اِس لئے قرآن کے ربوا کا

---

[۱] جس کا جناب یعقوب شاہ صاحب نے ذکر کیا ہے۔

اطلاق اس پر نہیں ہوگا۔ کمرشل انٹرسٹ کا رواج نزولِ قرآن کے وقت ہو یا نہ ہو۔ اس سے کچھ بحث نہیں ہونی چاہیئے۔ فیصلہ یوں ہوگا کہ ربوا کی سپرٹ اس میں پائی جاتی ہے یا نہیں۔ اگر پائی جاتی ہے تو وہ ربوا ہے۔ ورنہ نہیں۔ اسے یوں سمجھیئے کہ قرآن میں فحشاء کی چند ہی شکلیں بیان کی گئی ہیں جو اُس وقت عرب میں رائج تھیں۔ موجودہ دَور میں بعض ایسی اقسام فحشا بھی پائی جاتی ہیں جو پہلے موجود نہ تھیں۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ اس وقت فحشاء کا اطلاق فلاں فلاں قسم پر ہی ہوتا تھا۔ اس لیئے نوایجاد فحشاء اس میں داخل نہیں ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی خاص شکل بیع نزولِ قرآن کے وقت نہ پائی جاتی ہو تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ اُس وقت یہ شکل موجود نہ تھی۔ لہٰذا اس پر ربوا کا اطلاق نہیں ہو سکتا، اگر یہ ہو تو پھر یہ بھی دعویٰ کیا جا سکے گا کہ بیع کی فلاں شکل چونکہ اس وقت موجود نہ تھی، لہٰذا یہ بیع بھی نہ ہوگی۔ دراصل آئندہ پیدا ہونے والی تمام صورتوں میں صرف یہ دیکھا جائے گا کہ اس میں سپرٹ کس چیز کی پائی جاتی ہے۔ اگر بیع کی سپرٹ ہو تو بیع ہوگی اور ربوا کی روح ہو تو ربوا ہوگا۔ ہمیں کمرشل انٹرسٹ کو اسی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیئے کہ اس میں کونسی روح غالب ہے۔ بیع کی یا ربوا کی؟

قرض بھی انفاق کی ایک صورت ہے

انفاق کی ایک شکل قرض بھی ہے۔ حاجت مندوں کی حاجت روائی قرآن کا سب سے بڑا مشن ہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ اہلِ ثروت حاجت مندوں کی حاجت روائی کے لئے اپنے ہاتھ کھلے رکھیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ انہیں یوں ہی

دے دیں (انفقوا) اور اگر یوں نہ دے سکیں تو بطور قرض دے دیں۔ (اذا تداینتم بدین الخ) قرض بھی نہ دے سکیں تو کچھ رہن رکھ کر دیدیں (فرھان مقبوضۃ) اگر بروقت قرض ادا نہ ہو سکے تو مزید مہلت دیں (فنظرۃ الی میسرۃ) غرض انسانیت کے ہر ممکن تقاضے کو پورا کریں۔ حتٰی کہ "دیوالئے" کا قانون بھی احادیث میں موجود ہے، جسے "تفلیس" کہتے ہیں۔ یعنی مفلس قرار دینا۔ مسلم اور اصحاب سنن حضرت ابو سعید سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

اصیب رجل فی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ثمار ابتاعھا فکثر دینہ فافلس فقال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تصدقوا علیہ فتصدق الناس فلم یبلغ ذالک وفاء دینہ فقال صلی اللہ علیہ وسلم لغرمائہ خذوا ما وجدتم لیس لکم الا ذالک۔

عہدِ نبوی میں ایک شخص نے پھل خریدے مگر اُس پر کوئی آفت آگئی۔ اور وہ مقروض ہو کر دیوالیہ ہو گیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ: لوگو اسے صدقہ دو۔ سب نے صدقات پیش کئے لیکن اس کے قرض کے برابر پھر بھی نہ ہو سکا۔ حضورؐ نے اس کے قرضخواہوں سے فرمایا کہ: یہ جو کچھ ہے سو لے لو اس کے سوا تمہارا اور کوئی حق نہیں رہا۔

غرض ہر طرح حاجتمندوں کی امداد پر ابھارا گیا ہے لیکن .....

انفاق کی بہتر شکل اس طرح فی سبیل اللہ امداد کرنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے اور اس طرح کی مسلسل امداد میں ایک بڑا تاریک پہلو یہ بھی موجود ہے کہ اس سے مفت خوروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی قومی یا انسانی خدمت نہیں۔ انفاق، صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ کا یہ مقصد ہی نہیں کہ دُنیا ایک طبقہ خیرات دینے والا اور دوسرا بھیک لینے والا موجود رہے۔ اسلام کے معاشی نظام کی اسپرٹ یہ ہے کہ معذوروں کے سوا ہر شخص اپنی محنت سے رزقِ حلال کمائے اپنی قوّتِ بازو پر بھروسہ کرے اور دوسروں کا محتاج نہ رہے۔ بے کاروں اور مُفت خوروں کی تعداد میں اضافہ کرنے سے یہ بدرجہا بہتر ہے کہ چند کو خود کفیل بنا دیا جائے۔ اگر ایک ہزار آدمیوں کو ہر روز دونوں وقت کھانا کھلایا جائے تو کیا اس سے یہ بہتر نہ ہوگا کہ سَو کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ اپنی محنت سے خود روزی پیدا کر کے دس دس کی کفالت کرنے لگیں؟

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو بظاہر بے کار یا مفت خور نظر آتے ہیں۔ لیکن اُن کے اندر ایسی صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ اگر ان کی مالی اعانت کی جائے تو وہ کوئی کاروبار کر کے اپنے آپ کو سنبھال سکتے ہیں۔ ان کو قرض دینے سے زیادہ بڑی نیکی اور کیا ہو سکتی ہے۔

دو طرفہ منافعہ لیکن جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے۔ فی سبیل اللہ امداد

کرنے والے بہت کم تعداد میں ہوتے ہیں۔ عام طور پر لوگ معذوروں کی امداد میں تو عذر نہیں کرتے لیکن اگر اُنہیں یہ علم ہو کہ ہماری دی ہوئی رقم سے کوئی شخص معقول نفع حاصل کر سکتا ہے تو قدرتاً ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس میں ہم بھی شریک ہوں۔ تاکہ اُس کا بھی فائدہ ہو اور ہمارا بھی۔

یہیں سے تجارتی نفع کی مشارکت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ جس کی ایک شکل مضاربت ہے اور دوسری کمرشل انٹرسٹ۔ قرض دینے والا بھی دیکھتا ہے کہ اگر خود تجارت کروں تو اس رقم سے اتنا نفع حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ اگر دوسرا اسی رقم سے تجارت کرے تو اس کے نفع میں شریک نہ ہوں۔

ایک شبے کا ازالہ

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ اُوپر بھی لکھا گیا ہے۔ کہ قرض دینے والا خود کیوں نہیں تجارت کرتا تاکہ کمرشل انٹرسٹ کا سوال ہی نہ پیدا ہو؟ بلاشبہ ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ کسی تاجر کو قرض دینے کی بجائے خود ہی تجارت کرے، لیکن اس صورت میں اس غریب کا کیا بھلا ہو گا جو تجارتی کاروبار کے لئے قرض لینا چاہتا ہے۔ قرض دینے والا اسے اتنا معذور نہیں پاتا کہ اسے یوں ہی قرض دے دے یا وہ جس چیز کا کاروبار کرنا چاہتا ہے اس میں اُسے (قرض دینے والے) کو کوئی تجربہ نہیں اس لئے وہ چاہتا ہے کہ اسے قرض دے۔ جس سے اُسے بھی فائدہ پہنچے اور میں بھی اس میں شریک ہوں۔

دوسرا شبہ اور اُس کا ازالہ

یہاں یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مضاربت پر کیوں معاملہ نہیں کرتا؟ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص غلّے کی تجارت کرتا ہے اور اُس کے پاس خاصی رقم بھی موجود ہے۔ ایک دوسرا شخص اُس سے کہتا ہے کہ میں "بس سروس" کا تجربہ رکھتا ہوں مگر میرے پاس سرمایہ نہیں۔ اگر تم رقم لگاؤ تو اس میں خاصا منافعہ ہو سکتا ہے جس میں ہم دونوں شریک ہوں گے۔ اب ظاہر ہے کہ غلّے کی تجارت کرنے والا اگر غلّے کی تجارت میں اپنا روپیہ لگائے تو لگا سکتا ہے۔ لیکن اس میں خود اس کا اپنا فائدہ ہے۔ موٹر سروس والے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں غلّے کے علاوہ بس سروس کا کام بھی شراکت میں کروں۔ لیکن اسے یہ بھی خیال ہوگا کہ میں خود موٹر کے کام سے بالکل نابلد ہوں اور میری ناواقفیت سے یہ ناجائز فائدہ اس طرح اُٹھا سکتا ہے کہ مضاربت میں میرا جو حصّہ آتا ہے اس میں بےایمانی سے کام لے اور مجھے پورا حصّہ نہ مل سکے۔ نیز نہ تو میں اس ٹیکنیکل کام سے واقف ہوں۔ نہ اس کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کے لئے میرے پاس اپنے کاموں سے وقت نکل سکتا ہے۔ اس صورت میں وہ یہ کرتا ہے کہ اس کام کے لئے جتنی رقم دیتا ہے۔ اس کے منافعے میں اپنا تناسب (RATIO) مقرر کرنے کی بجائے ایک قلیل مگر معیّن منافعے پر قناعت کرتا ہے اور رقم لینے والا بھی اپنے تجربے کی بنا پر یہ اندازہ کر لیتا

ہے کہ اتنی یعین رقم دینے میں میرا کوئی نقصان نہیں بلکہ پھر بھی فائدہ ہے اور مضاربت سے کم فائدہ نہیں۔ یہی ہے انفرادی کمرشل انٹرسٹ کی صورت جس میں کسی ایک فریق کا یک طرفہ نفع اور دوسرے کا نقصان نہیں۔ کمپنی یا بینک کی اجتماعی شکل کو بھی اسی پر قیاس کر لیجئے۔ ایسے تجارتی معاملے کو صرف تعیین رقم کی وجہ سے ربوا کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ کسی فریق پر کوئی ظلم نہیں ہوتا اور لا تظلمون و لا تظلمون کی تعمیل ارشاد ہو جاتی ہے۔

ربح اور ربوا کا فرق محض لفظی نہیں

ایک بہت غور طلب سوال یہ ہے کہ بیع یعنی تجارت اور ربوا میں کیا فرق ہے۔ فرق بھی ایسا کہ ایک تو اعلیٰ درجے کا کسب حلال (و احل اللہ البیع) اور دوسرا قطعی حرام (و حرم الربوا) اور حرام بھی ایسا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کا اعلان العیاذ باللہ۔ عقل سلیم بتاتی ہے کہ ان دونوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ لیکن وہ ایسا بدیہی فرق نہیں جو بکری اور شیر میں ہے بلکہ اس فرق میں ذرا گہرائی، باریکی اور نزاکت ہے۔ سطحی نظر سے دیکھا جائے گا۔ تو یہ کہا جائے گا کہ انما البیع مثل الربوا یعنی جس طرح تجارت میں نفع ہوتا ہے اسی طرح سود خواری میں بھی منافع ہوتا ہے۔ محض منافع پر نظر رکھی جائے۔ تو دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں دکھائی دے گا۔ کیونکہ تاجر دس روپے کا مال خرید کر گیارہ میں فروخت کرتا ہے اور سود خوار دس روپے دے کر گیارہ وصول

کرتا ہے بلکہ تاجر تو اسی وقت دس کا مال دے کر گیارہ کھرے کر لیتا ہے اور سود خوار ایک ماہ کی مہلت دے کر دس کے گیارہ بناتا ہے۔ دس کے گیارہ بھی کہاں؟ اس سے بھی دس گنا کم یعنی سَو دے کر شاید ایک سو ایک لیتا ہے، گویا بظاہر منافعہ دونوں ہی میں نظر آتا ہے، اس لئے سود خوار دعویٰ کر بیٹھتا ہے کہ انما البیع مثل الربوا۔ لیکن اللہ اور اُس کے رسولؐ کی نظر اس معمولی سی یکسانی پر نہیں۔ اس کے عواقب پر اور سب سے زیادہ اس (ATTITUDE) رجحان پر ہے، جو تاجر اور سود خوار کے درمیان دیوار آہنی کی طرح حائل ہو کر فرق و امتیاز پیدا کرتا ہے۔

ایک مثال سے اسے یوں سمجھئے کہ اگر محض حصولِ لذّت کو اساس قرار دے کر دیکھا جائے تو سفاح (زنا) اور نکاح میں کوئی فرق نظر نہ آئے گا۔ جنسی اختلاط دونوں میں یکساں ہے۔ لیکن جب زن و مرد کی زندگی کے دوسرے متعلّقات کے عام پہلوؤں پر نظر ہو تو صاف ایک حرام اور دوسرا حلال دکھائی دیگا۔

اب آیئے غور کریں، عقل و نقل کی روشنی میں غور کریں۔ کہ وہ کیا کیا نتائج ہیں کہ جو بیع اور ربوا کو بالکل متضاد بنا دیتی ہیں؟

ملاحظہ ہو:۔

(۱) تاجر ایک مال خریدتا ہے جس کے نقل و حمل پر بھی کچھ مزید رقم صرف کرتا ہے۔ وہ اپنا وقت بھی دیتا ہے اور محنت بھی کرتا ہے اور اپنے سودے کو

ایک قلیل منافعے پر فروخت کرتا ہے۔ سُود خوار کوئی مال نہیں خریدتا بلکہ روپے ہی کو مال قرار دیتا ہے اور روپیہ ہی اضافے کے ساتھ وصول کرتا ہے۔ تاجر کی طرح حمل و نقل اور محنت نہیں کرتا۔ گویا اس میں مفت خوری کا جذبہ غالب ہوتا ہے۔ اور وہ اُس چیز کو مال بناتا ہے جو خود مال نہیں، بلکہ دراصل صرف ذریعۂ حصولِ مال ہے۔

۲۔ تاجر کا جذبہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے کسٹمر (گاہک) زیادہ سے زیادہ خوش حال رہیں۔ تاکہ ہماری خوب بکری ہوتی رہے لیکن سود خوار کی نیّت یہ ہوتی ہے کہ یہ مقروض کبھی قرض ادا کرنے کے قابل نہ ہو۔ تاکہ ہماری سُود در سُود کی رقم میں اضافہ ہوتا رہے اور آخر میں وہ ایسا مجبور ہو جائے کہ اس کی بچی کھچی جائداد کو قرق کرا لیا جائے۔

۳۔ تاجر اگر دس کا مال گیارہ میں دیتا ہے تو وہ ایک روپیہ منافعے کا ہوتا ہے جو وہ لیکر معاملے کو ختم کر دیتا ہے لیکن سود خوار سَو روپے دینے کے بعد مسلسل عرصۂ دراز تک اپنی رقم کا سود لیتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ سود کی رقم راس المال سے کئی گنا ہو چکنے یا وصول کرنے کے بعد بھی واجب الادا راس المال اُسی طرح کھڑا رہتا ہے۔

۴۔ تاجر عموماً ضروریاتِ زندگی سے متعلق چیزیں لاتا ہے اور تحت الشعور یہی جذبہ ہوتا ہے کہ اس سے لوگوں کی ضروریات پوری ہوں گی۔ اور ہمیں ہماری محنت کا

کا صلہ مل جائے گا۔ لیکن سود خوار کو اس سے کچھ بحث نہیں ہوتی کہ اس رقم قرض سے کسی کی ضرورت پوری ہوتی ہے یا نہیں، اسے صرف اپنے سود سے دلچسپی ہوتی ہے اور بس۔

غرض معاملہ صرف لین دین کا نہیں، بلکہ انسانیت کے قیام و بقاء کا ہے۔ ایک کاروبار میں ظلم، جبر، استبداد، حرص و آز، جذبۂ نفع اندوزی، خود غرضی۔ موقع پرستی، بے دردی، انسانیت کشی، التحصول اور استعباد ہے۔ اور دوسرے میں یہ جذبات نہیں۔ دونوں میں فرق و امتیاز پیدا کرنے والی شے صرف انسانی زاویۂ نگاہ ہے ورنہ بظاہر دونوں لین دین مماثل نظر آتے ہیں۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ جب اس قسم کے انسانیت کُش عناصر کسی دوسرے موقعے پر پیدا ہوں گے، تو خواہ اس کا نام تجارت اور کاروبار ہی رکھا جائے۔ لیکن درحقیقت وہ بھی ربوٰا ہی کی کوئی نہ کوئی قسم ہوگی۔ اگر ایک تاجر اپنی تجارت میں فریب و کذب سے کام لیتا ہے۔ یا کسی ضرورت مند کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھاتا ہے۔ یا احتکار کی نیت سے ذخیرہ اندوزی کرتا ہے وغیرہ وغیرہ تو وہ دراصل ربوٰا کا کاروبار کر رہا ہے، تجارت نہیں کرتا۔ نہ تو دس روپیہ دے کر گیارہ روپیہ وصول کرنا ربوٰا ہے اور نہ دس کا مال گیارہ روپے میں فروخت کرنا تجارت ہے۔ اس کا فیصلہ جذبۂ دروں، نیت اور مقصد سے ہوتا ہے۔

ربوا کے مفہوم میں کتنی وسعت ہے۔ اس کا اندازہ اس حدیث نبویؐ سے کیجئے:۔

الربوا اثنان وسبعون بابا ادناها مثل اتیان الرجل امه وان اربی الربا استطالة الرجل فی عرض اخیه۔

(رواہ الطبرانی عن البراء بن عازب)

ربوا کی بہتر یعنی بے شمار قسمیں ہیں۔ اس کا جو کم سے کم درجہ ہے وہ ایسا ہے۔ جیسے اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرنا اور اس کی بدترین قسم اپنے بھائی کی آبرو پر ہاتھ صاف کرنا ہے۔

ربوا کی یہ بدترین قسم پوری قوم میں رائج ہے۔ اسے کوئی نہیں پوچھتا لیکن اگر فروغ تجارت اور دوطرفہ منافع کے لئے کمرشل انٹرسٹ ہو تو لفظ انٹرسٹ آجانے سے اسے ربوا قرار دے دیا جاتا ہے۔ کیا یہ بوالعجبی قابل غور نہیں؟

۴

سُود کا مسئلہ

(محترم جناب عطاء اللہ صاحب پالوی)

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ (لاہور) کے ترجمان رسالہ "ثقافت" بابت مارچ ۱۹۵۵ء میں محترم یعقوب شاہ صاحب سابق آڈیٹر جنرل پاکستان کا ایک طویل مضمون بعنوان "سُود کے متعلق چند سوالات" شائع ہُوا ہے۔ اور اس وقت تک صرف مولانا شاہ محمد جعفر صاحب پھلواردی کا جواب نظروں سے گزرا ہے۔

محترم یعقوب شاہ صاحب نے اپنے مؤکر مقالہ میں تمہیداً بتایا ہے کہ کیوں اُنھوں نے یہ مقالہ سپردِ قلم کیا۔ فرماتے ہیں :-

"مندرجہ ذیل سطور کے تحریر کرنے پر مجھے جس چیز نے مجبور کیا ہے وہ یہ ہے کہ میرا عمر بھر کا اثاثہ پراویڈنٹ فنڈ کی صورت میں تھا اور اس میں ایک کثیر رقم سود کی شامل تھی مجھے اب تک اس کا تسلی بخش جواب نہیں مل سکا کہ یہ رقم میرے لئے جائز ہے

یا ممنوع ؟ جن علمائے کرام سے مَیں نے رجوع کیا۔ اُن میں سے اکثر نے اِسے حرام کہا۔ لیکن ان میں سے دو نے جن کا مجھے بڑا احترام ہے اس کو جائز قرار دیا۔ ایک صاحب نے لکھ کر اور دوسرے صاحب نے زبانی۔ اِس لئے مَیں نے اِس مسئلے کے متعلق اُردو انگریزی میں لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ لیکن جو کتابیں میری نظر سے گزریں۔ اُن سے میری تشفی نہیں ہوئی۔ فیصلہ طلب امر یہ ہے کہ آیا ہر قسم کا سود جو آج کل رائج ہے "ربوا" کے تحت آتا ہے اور اس کے قرآنی احکام کے مطابق حرام ہے یا اس کی کچھ ایسی صورتیں بھی ہیں۔ جن پر "ربوا" کا اطلاق نہیں ہوتا اور جن سے مسلمان بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔ باوجود کافی تگ و دو کے میں اِس سوال کا تشفی بخش جواب دریافت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

اِس کے بعد انہوں نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ "الربوا" سے وُہ خاص قسم کا سود مراد ہے جو عہدِ نزولِ قرآن میں اہلِ عرب کے یہاں رائج تھا۔ اِس لئے محترم مقالہ نگار نے تاریخ سے پتہ چلانے کی کوشش کی کہ وہ کون کون سی قسم تھی ؟ مگر باوجود کوشش کے اُنہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ عرب جاہلیت میں "ربوا" کے اصطلاحی معنے کیا کیا تھے ؟ اور تجارتی قرضوں پر بھی سود لیا جاتا تھا یا نہیں۔ اِس کے بعد اُنہوں نے

ایک جگہ فرمایا ہے کہ:-

"میں یہ گذارش پیش کرنے کی جراُت کرتا ہوں کہ جب تک اس کا ثبوت نہ مل جائے کہ ایامِ جاہلیت میں نفع آور کاموں کیلئے بھی سود پر قرض لیا جاتا تھا، ہمیں "الربوا" کو حاجتمندانہ اور صرفی قرضوں تک ہی محدود رکھنا چاہیئے اور صرف گمان کی بنا پر سود کی اور صورتوں کو حرام کر لینے کی تنگی میں نہ پھنسنا چاہیئے ..... اللہ تعالی نے جو بڑھوتری حرام قرار دی تھی وہ وہ تھی، جس کو اُس وقت "الربوا" کہتے تھے۔ اگر عربوں میں یہ نام اُن دنوں ایسی بڑھوتری کیلئے ہی استعمال ہوتا تھا تو ہمیں کیا اختیار ہے کہ اُس کو اس سے زیادہ وسیع معنی دیں، اور ایسے قرضوں کی بڑھوتری کو بھی اس میں شامل کر لیں جن میں حاجتمندانہ اور صرفی قرضوں کی خرابیاں نہیں پائی جاتیں۔ صرف نام سے تو حرمت کا اطلاق ہو نہیں جاتا۔ اگر کسی شربت کو شراب کہہ دیا جائے تو وہ حرام تو نہ ہو جائے گا۔ جب تک اُس میں نشہ لانے والی ضرر رساں صفت موجود نہ ہو۔ اسی طرح کسی سود کو جس میں وہ نقائص نہ پائے جاتے ہوں جو حاجتمندانہ اور صرفی قرضوں کے سود میں موجود ہیں۔ "ربوا" نہ کہنا چاہیئے"۔ آخر میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

"جو نظریہ گذشتہ سطور میں آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے اُس کی بناء اس پر ہے کہ عرب جاہلیت میں نفع آور کاموں کے لیئے سود پر قرض

نہ دیا جاتا تھا۔ لیکن مجھے اپنی کم علمی کا پورا احساس ہے۔ میں نے پوری ایمانداری کے ساتھ اس بات کو معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان دنوں ایسے قرض رائج تھے۔ لیکن مجھے اس کے ثبوت میں کوئی معتبر روایت نہیں مل سکی۔ اگر کسی صاحب کو کوئی ایسا قابلِ اعتبار حوالہ معلوم ہو جس سے اس مفروضہ کی صحت پر حرف آسکے تو ازراہِ کرم اس سے مطلع فرما کر میری راہنمائی فرمائیں۔"

سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ قرآن اس کا محتاج ہے کہ جب تک نزولِ قرآن کے وقت کی یا اس سے پہلے کی بالفاظِ دیگر ایامِ جاہلیت کی تاریخ عرب ہمارے سامنے نہ ہو۔ اُس کے احکام سمجھے ہی نہیں جا سکتے؟ کہا جاتا ہے کہ قرآن ساری دُنیا کے لئے اور قیامت تک کے لئے آخری قانونِ الٰہی بن کر نازل ہُوا ہے نہ کہ چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے اہلِ عرب کے لئے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو اللہ تعالیٰ پر تو یہ حقیقت ظاہر و آشکارا تھی کہ عربوں کے رسم و رواج، معاشرت و معاملات اور لین دین کی تاریخ پہلے سے مرتب و مدوّن نہیں اور نہ نزولِ قرآن کے بعد صدیوں مدوّن ہو گی اور بعد میں پھر جتنی ہو گی بھی وہ نہ تو مکمل اور مستند ہو گی۔ اور نہ وہ قرآن کے ساتھ ساتھ ساری دنیا میں پہنچے گی۔ پھر اُس نے ربوا کے سے اہم دینی و دنیوی مسئلے سے متعلق یہ کیسے احکام نازل کئے کہ جب تک عربوں کے سُودی لین دین کی پوری مستند تاریخ دنیا کو معلوم نہ ہو۔ جس کا کوئی امکان ہی نہیں اُس

وقت تک ربوا والی آئیتیں کبھی ہی نہیں جا سکیتیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر بفرضِ محال اِس طرح کی کوئی روایت مل بھی جائے۔ جس سے ظاہر ہو کہ اُس وقت تجارتی ضرورت کے لئے بھی سودی قرض لیا جاتا تھا تو کیا اس صورت میں ربوا مطلقاً حرام ہو کر رہ جائے گا؟ اور فاضل مقالہ نگار اپنی رائے بدل دیں گے اگرچہ وہ قرآن سے نہ بھی ثابت ہو؟

ہمارا خیال یہ ہے کہ اگرچہ احکام قرآنی اُس وقت کے عرب کے حالات و واقعات اور ضرورت کے مواقع ہی پر نازل ہوئے، مگر اس معجزانہ جامعیت کے ساتھ آیات نازل ہوئیں کہ جب اور جہاں ضرورت پیش آئے وہ بلا کم و کاست بلا کسی اور بلا قید زمان و مکان بڑی عمومیت کے ساتھ منطبق ہو سکیں اور غیر قرآنی سہارے کا محتاج نہ رہیں۔ لہٰذا ہمیں سارے لٹریچر کو کیونکہ وہ شک و ریب سے ہرگز پاک نہیں۔ چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی مرضی معلوم کرنے کے لئے صرف بے شک و ریب قرآنی آیات کو غور و فکر، تلاش و جستجو اور اخذ و استنباط کا مخزن بنانا چاہیئے اور چونکہ قرآن مکمل طور پر نوعِ انسانی کی ہر طرح کی فلاح و بہبود کے لئے ہر زمانہ، ہر دور اور ہر ملک کی ہر حالت کی ضرورتوں اور تقاضوں کی جامعیت لئے ہوئے رہنما بن کر آیا ہے۔ اِس لئے یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ کسی متلاشی کو کسی اہم معاملے میں صحیح راستہ بتانے سے قاصر و عاجز رہے ہے۔ تلاش و جستجو اور غور و فکر سے مرضئ الٰہی آشکارا اور ظاہر ہو کے رہے گی

"ربوا" کے سلسلے میں انسانی راؤں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ہمارے یہاں صرف الفاظ سے کھیلا جاتا ہے۔ حالانکہ ہر قانون بنانے کا کچھ مقصد و منشا ہوتا ہے اور تمام قوانین کی کچھ غائت یا روح ہوتی ہے اور اس کے سلسلے کے سارے الفاظ کا کچھ مقصد ہوتا ہے۔ محض الفاظ بازی نہیں ہوتی۔ آج ہمارے یہاں ایک شخص قرآن بیچتا اور دوسرا خریدتا ہے مگر دونوں "قیمت" کا لفظ نہیں بولتے بلکہ لفظ "ہدیہ" استعمال کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طور سے وہ قیمت، قیمت نہ رہی۔ وجہ اس کی یہ بتاتے ہیں کہ بھلا قرآن کی قیمت کون دے سکتا ہے۔ اِس لئے ہدیہ کہا جاتا ہے۔ یہ سوائے کلمہ بازی کے اور کیا ہے؟ جو شخص بھی کوئی کتاب خریدتا اور اُس کی قیمت ادا کرتا ہے وہ نہ تو مصنف کے دماغ کی قیمت دیتا ہے اور نہ کتاب کے متن کی، بلکہ وہ صرف اُس کتاب کی کتابت طباعت۔ کاغذ، روشنائی اور جلد کی قیمت دیتا ہے۔ پھر قرآن کی خرید و فروخت میں قرآن کے متن کا کیا سروکار کہ اُس کے لئے غلط لفظ ہدیہ بولا جائے جبکہ ہدیہ نام ہے بلا قیمت تحفۃً کسی کو کوئی چیز دینے کا؟ بالکل یہی حال ہمارے یہاں ربوٰا کا ہے کہ جس چیز کو "سود" کہہ دیجئے وہ فوراً حرام قرار پا جاتا ہے، چاہے وہ کسی جائز طریقے سے بھی حاصل ہو اور جس چیز کو "منافعہ" کہہ دیجئے وہ بالکل حلال سمجھا جاتا ہے۔ چاہے وہ کتنے ہی ناجائز طریقے

پر وہ وصول کیا گیا ہو۔ حالانکہ "ربوٰا" کے معنے صرف "بڑھوتری" کے ہیں اور اس کا اطلاق "منافعہ" پر بھی ہو سکتا ہے جو عربی ہے اور "سود" پر بھی، جو فارسی ہے۔ اور منافعہ ہو یا سود، زمانہ کے انقلاب اور معاشی و تمدنی حالات کی صورتیں بدل جانے کے سبب اُس کی مختلف قسمیں اور شکلیں ہو گئی ہیں۔ لہٰذا محض نام سے کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ عربی میں جو منافعے کے معنے ہیں وہی فارسی میں سود کے ہیں۔ ایسی صورت میں ضرورت اس کی ہے کہ اُس اسپرٹ یا روح غایت یا مقصد کو سمجھا جائے جو "ربوٰا" کی ممانعت میں پنہاں ہے اور اُن آیات و احکام پر غور کیا جائے جو اس سلسلے میں قرآن میں وارد ہیں۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آیا "ربوٰا" فی نفسہ ممنوع ہے یا کسی خاص محل اور موقعے پر ممنوع قرار دیا گیا ہے؟ فی نفسہ کسی چیز کا ہمیشہ کے لئے ممنوع یا جائز ہونا اور بات ہے اور کسی شے کا مختلف حالتوں میں حلال یا حرام ہونا بالکل دوسری چیز ہے۔ لہٰذا نہ تو نام کی تبدیلی سے ماہیت بدل سکتی ہے اور نہ شکل کی یکسانی سے اسپرٹ ختم ہو سکتی ہے۔ اب آئیے خود قرآن میں غور کیا جائے کہ "ربوٰا" کے سلسلے میں کون کون سی آیتیں قرآن میں وارد ہیں اور اُن سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

خود محترم مقالہ نگار نے بتایا ہے کہ قرآن میں چار مقامات پر ربوٰا کا ذکر ہے اور وہ چاروں مقامات یہ ہیں:

(۱) سورۂ روم۔ رکوع ۴۔ $\frac{۳۰}{۳۹}$

(۲) سورۂ نساء۔ رکوع ۲۲۔ $\frac{۶}{۱۶۱}$

(۳) سورۂ آل عمران۔ رکوع ۱۴ $\frac{۳}{۱۳۰}$

(۴) سورۂ بقرہ۔ رکوع ۳۸ $\frac{۲}{۲۷۵ - ۲۷۹}$

سورۂ روم کی آیت یہ ہے:۔

وَمَا اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ وَمَا اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ٥ $\frac{۳۰}{۳۹}$	اور جو تم ربٰوا دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں افزائش ہو تو خدا کے نزدیک اس سے افزائش نہیں ہوتی اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو اور اس سے خدا کی خوشنودی طلب کرتے ہو تو ایسے ہی لوگ دوگنا تگنا کرنے والے ہیں۔

اس آیت میں فی نفسہ ربٰو کی حلّت وحرمت کا کوئی ذکر نہیں، نہ اس کا کہ کس سے ربٰوا نہیں لینا چاہیئے اس آیت میں زکوٰۃ اور ربٰوا دینے والوں سے خطاب ہے اور صرف یہ بیان ہے کہ ربٰوا سے مال نہیں بڑھتا بلکہ زکوٰۃ سے مال بڑھتا ہے۔ اِس مقام پر جو اس سے پہلی آیت ہے۔ اگرچہ اس میں ربٰوا کا کوئی ذکر نہیں، مگر وہ بے تعلّق بھی نہیں۔

وہ آیت یہ ہے:۔

فَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ذٰلِکَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ ۳۰/۳۸

سو اہلِ قرابت کو اُن کا حق دیتے رہو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو۔ یہ اُن کے حق میں بہتر ہے جو رضائے حق کے طالب ہوں اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔

اِسلام نے باہمی محبت و ہمدردی اور سلوک و احسان کو سب سے بڑا فریضۂ اِنسانی قرار دیا ہے۔ اِسی لئے لاتعداد مقامات پر طرح طرح سے حسن سلوک، اِمداد باہمی، حاجت روائی اور ایثار و قربانی کا حکم دیا ہے۔ تاکید کی ہے، ترغیب دی ہے، ڈرایا ہے، سمجھایا ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کرو، اگر تم فارغ البال ہو تو ضرور تمندوں کی ضروریات پوری کرو۔ تاآنکہ مومن کی جو سب سے بڑی تعریف کی گئی ہے وُہ یہ ہے۔ کہ

یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ وَلَوْ کَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ ۵۹/۹

وہ ہمیشہ دوسروں کو اپنے اُوپر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ وہ خود تنگی و مصیبت ہی میں کیوں نہ ہوں۔

یعنی مومن وہ ہے جو خود فائدہ اُٹھانے کے بجائے دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا خیال رکھے۔ اگرچہ اس کے سبب اُسے خود تکلیف ہی کیوں نہ اُٹھانی پڑے۔ یہ ایثار و قربانی کی انتہا ہے۔

دوسرا مقام ذکر ربوا کا سورۂ نساء کی آیت ہے جو دراصل مسلمانوں سے نہیں

بلکہ یہودیوں سے متعلق ہے۔ اُن کی سزایابی کی وجوہ بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ:

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا۔ ۴/۱۶۱

اور اس سبب سے بھی کہ باوجود منع کئے جانے کے بھی وہ ربوٰا لیتے تھے، اور اس لئے بھی کہ وہ لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے اور ان میں جو کافر ہیں اُن کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں کہ کن لوگوں سے ربوٰا لینا ممنوع قرار پایا تھا۔ صرف یہ بیان ہے کہ یہودی ممانعت کے باوجود ممنوع سود لیتے تھے۔ اس سے یہ عبرت وبصیرت حاصل ہوتی ہے کہ حکم کے خلاف کرنے والوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

تیسرا مقام سورۂ آل عمران ہے، جس میں بلاواسطہ مسلمانوں سے خطاب ہے کہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ ۳/۱۳۰

اے ایمان والو! دوگنا چوگنا ربوٰا نہ لو اور خدا سے ڈرو تاکہ ان میں سے ہو جاؤ جو فلاح پانے والے ہیں۔

اس آیت میں بھی فی نفسہٖ ربوٰا کی ممانعت نہیں، بلکہ دوچند سہ چند ربوٰا لینے کی ممانعت ہے۔ اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ربوٰا کی رقم راس المال سے بڑھنی چاہیئے۔ دوسرے ربوٰا کی رقم پر مزید ربوٰا ممنوع ہے۔ اس میں بھی یہ ذکر

کہ کن سے ربوٰا لیا جائے اور کن سے نہیں لینا چاہیئے۔

چوتھا مقام سورۂ بقرہ کی آیات ہیں اور میری دانست میں یہی آیات دراصل "ربوٰا" کے سلسلے کی تمام تفصیلات کی حامل ہیں۔ سورۂ بقرہ کی ہی آیات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ "ربوٰا" کے قانون میں کونسا جذبہ کام کر رہا ہے۔ یعنی لجیسلیشن کا انٹینشن کیا ہے؟ اور اُسی کی ایک آیت سے یہ بھی صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ربوٰا کن لوگوں سے لینا ممنوع ہے؟ مگر قبل اس کے کہ سورۂ بقرہ کی وہ آیات پیش کی جائیں تمہیداً چند الفاظ سن لیجیے:

ربوٰا والی زیر بحث آیتیں سورۂ بقرہ کے اڑتیسویں رکوع کی دوسری آیت سے شروع ہوتی ہیں۔ اس رکوع سے پہلے کے دو رکوع یعنی چھتیسویں اور سینتیسویں رکوع کو (۲/۲۶۱-۲۷۳) پڑھ لیجیے۔ ان میں یہاں سے وہاں تک سوائے انفاق وصدقہ یعنی فی سبیل اللہ خرچ یا خیر خیرات بالفاظ دیگر ضرورتمندوں کی امداد اور غریبوں، ناداروں، پریشان حالوں اور مفلسوں کی حاجت روائی کی فضیلت، ترغیب، تحریص اور حکم کے دوسری کوئی چیز بیان نہیں ہوئی ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بھی ہے کہ جن پر احسان کرو اُن پر احسان مت دھرو۔ جن کی امداد کرو اُن کو طعنے مت دو۔ جن کی حاجت روائی کرو اُن کی دل آزاری نہ کرو۔ ان تمہیدوں کے بعد اڑتیسواں رکوع شروع ہوتا ہے جس میں ربوٰا کا ذکر ہے اور اس رکوع کی بھی سب سے پہلی آیت (۲/۲۷۴) یہ ہے:۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ — جو لوگ اپنا مال رات اور دن میں پوشیدہ اور

بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥

علانیہ خرچ کرتے ہیں۔ اُن کا صلہ اُن کے پروردگار کے پاس محفوظ ہے اور اُن کو خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس کے بعد ربوٰا کے سلسلے کی آیت یوں شروع ہوتی ہے:

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ٥

جو لوگ ربوٰا کھاتے ہیں وہ اس طرح اٹھیں گے جیسے کسی کو شیطان نے لپٹ کر مخبوط بنا دیا ہو۔ یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی تو ویسا ہی ہے جیسا ربوٰا اور بیع کو اللہ نے حلال کیا ہے تو ربوٰا حرام کیوں ہو؟ تو جس شخص کے پاس خدا کی نصیحت پہنچی اور وہ باز آگیا تو جو پہلے ہو چکا وہ ہو چکا۔ اب وہ اس کا ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو پھر لینے لگا۔ تو ایسے لوگ جہنمی ہیں۔ جو ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے۔

۲/۲۷۵

اس کے بعد ہے کہ:

یَمۡحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرۡبِی الصَّدَقٰتِ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیۡمٍ	اللہ ربٰو کو نابود کرتا ہے اور صدقہ کو بڑھاتا ہے۔ اور اللہ کسی ناشکرے گنہ گار کو دوست نہیں رکھتا۔

(۲/۲۷۶)

اب تک جتنی آیتیں پیش ہوئی ہیں۔ اُن میں کہیں بھی فی نفسہٖ ربٰوا کی حُرمت کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ کہیں ممنوع ربٰوا سے اضافہ راس المال کے خیال کی تردید کی ہے کہیں یہ حکم ہے کہ دوگنا چوگنا ربٰوا مت لو اور کہیں ممنوع ربٰوا لینے والوں کی سزا ہی کے ذکر کے ساتھ ساتھ اُن کی جانب سے کی جانے والی تاویل کا ذکر ہے اور یہیں پر ایک جملہ ایسا ہے جس سے فی نفسہٖ ربٰوا کو حرام سمجھا اور بتایا جاتا ہے یہ جملہ ہے "اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" جس کو اللہ تعالیٰ کا حکم تسلیم کیا جاتا ہے ہر چند کہ واقعۃً ایسا نہیں ہے۔ یعنی میرے نزدیک یہ خدا کا حکم نہیں ہے۔ بلکہ تاویل کرنے والوں ہی کے قول کا ایک ٹکڑا ہے۔ میں اس کے متعلق کچھ آگے عرض کروں گا۔ اگر بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ہے۔ تو بھی اِس سے فی نفسہٖ ربٰوا حرام قرار نہیں پاتا۔ کیونکہ یہاں جس بیع کے حلال اور ربٰوا کے حرام ہونے کا ذکر ہے وہ عام نہیں۔ بلکہ خاص ضرورت مند جماعت سے متعلق ہے۔ جیسا کہ میں آگے عرض کروں گا۔

سب سے پہلے "اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" خدا کا حکم ہے یا تاویل کرنے والوں کے قول کا ٹکڑا؟ سو میرا خیال یہ ہے کہ اس پر بعدی نتیجگی

سے غور نہیں کیا گیا، ورنہ صاف ظاہر ہو جاتا کہ یہ خدا کا حکم نہیں۔ سب سے پہلے محل وقوع کو دیکھئے۔ اگر واقعی یہ حکم، اللہ تعالیٰ کا ہوتا تو وہیں نہ ہوتا۔ جہاں بلا واسطہ مسلمانوں کو خطاب کر کے دوگنا تگنا ربوا لینے سے منع کیا گیا ہے کہ بات واضح اور صاف رہتی؟ یہ ایسی جگہ کیوں آیا جہاں دوسروں کا قول نقل ہو رہا ہے۔ اور جس میں شک و ریب یا اشتباہ کی پوری گنجائش ہے۔ دوسرے اس پر بھی غور فرمایئے کہ تاویل کرنے والوں کی پوری بات یا تاویل دونوں ٹکڑوں کو ملانے کے بعد ہی ہوتی ہے۔ ان دونوں جملوں کو الگ الگ کر دیجیے تو مطلقاً بات صاف نہیں ہوتی کہ تاویل کرنے والوں کا مطلب کیا تھا۔ تیسرے یہ، اللہ تعالیٰ کے حکموں کے اندازِ بیان کے بھی خلاف ہے۔ دیکھئے جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے تجارت کو حلال اور باطل مال کو حرام قرار دیا ہے تو کیا اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ فرماتا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ۔ (۴/۲۹)	اے مسلمانو! تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ مگر ہاں یہ کہ تم لوگ آپس میں تجارتی کاروبار کرو۔

بھلا معمولی بات کو تو یوں واضح اندازِ بیان کے ساتھ مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا گیا، مگر ربوا کی حرمت جیسے اہم مسئلے کو اس طرح بیان کیا گیا۔

جیسے عند التذکرہ کوئی ایسی چیز کے بارے میں ذکر کیا جاتا ہے جو پہلے واضح طور پر مذکور ہو چکی ہو۔ حلّت و حرمت کے سلسلے میں یہ انداز بیان قرآن کا اُسلوب نہیں۔ پھر تھے یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ بیع کو حلال قرار دے اور بڑھوتری کو حرام۔ کیونکہ بڑھوتری جزو لاینفک ہے بیع کا۔ تجارت کا دار و مدار بیع پر ہے اور بیع کا انحصار بڑھوتری پر۔ ورنہ پھر جتنے میں خرید ا اتنے ہی میں بیچو تو تجارت کا فائدہ؟ اِس زحمت کشی کا حاصل؟ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے تجارت اور بیع کا ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (۲۴/۳۷) — لوگ جنہیں تجارت اور بیع، اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی۔

لہٰذا یہ ٹکڑا ہرگز اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں، بلکہ تاویل کرنے والوں کے قول ہی کا دوسرا مربوط ٹکڑا ہے اور مطلب صاف ہے کہ جن لوگوں کو منع کیا جاتا ہے کہ تم لوگ ضرورتمندوں کو قرض دو تو اُن سے اُس پر کوئی بڑھوتری نہ لو تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ عجیب حکم ہے کہ جن لوگوں سے ہمیں ربا لینے سے منع کیا جاتا ہے۔ اگر ہم ان کے ساتھ بیع کا معاملہ کریں اور اُس میں جو بڑھوتری ہو وہ جائز و حلال قرار پائے تو یہ کیا بات ہوئی کہ ان ہی کو ہم کوئی رقم قرض دیں تو اُس پر اُن سے کوئی بڑھوتری نہ لیں؟ آخر بیع بھی تو ربا ہی کے مثل ہے، جس طرح اس میں بڑھوتری ہے۔ اُسی طرح اس میں بھی ہے پھر یہ کیا تماشا ہے، کہ اللہ نے ان ضرورتمندوں کے بیع کے

معاملے کو تو حلال قرار دیا ہے اور معاملۂ ربوا کو حرام ؟

ربوا کے سلسلے میں تاویل کرنے والوں کے قول کے دونوں ٹکڑوں کو الگ الگ کر کے ایک کو انسانی قول اور دوسرے کو قرآنی حکم قرار دے دینا کچھ بہت زیادہ تعجب خیز نہیں۔ قرآن نے عزیز مصر کا ایک قول نقل کیا ہے کہ اُس نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ:

اِنَّہٗ مِنْ کَیْدِکُنَّ ؕ اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ۔	بے شک یہ تمہارے ہی فریب میں سے ہے تمہاری چالاکیاں ہوتی ہی غضب کی ہیں۔

۱۲/۲۸

لوگوں نے اس قول کے پہلے ٹکڑے کو عزیز مصر کا قول اور دوسرے ٹکڑے کو قرآنی فیصلہ بنا دیا۔ چنانچہ مولانا آزاد کو کہنا پڑا کہ:-

"افسوس ہے کہ لوگوں نے اس مقولے کا اِس طرح استعمال شروع کر دیا گویا عورتوں کے جنسی اخلاق کے لئے یہ قرآن کا فیصلہ ہے ......

چنانچہ ہمارے مفسرین نے اس کا ایسا ہی مطلب قرار دیا ہے اور پھر حسب عادت وجوہ و مباحث کی دور دراز وادیوں میں گم ہو گئے ہیں ...... حالانکہ نہ تو قرآن کا یہ حکم ہے اور نہ عزیز کا قول ہی ایسے محل میں ہے کہ اطلاق وعموم کے سوالات پیدا ہوں۔"

اسی طرح اِسی سورۂ یوسف میں آیت نمبر ۵۱ تا نمبر ۵۳ تک عزیز مصر کی بیوی

کا وہ بیان نقل ہوا ہے جو اُس نے شاہی انکوائری کے وقت یوسفؑ کی غیر حاضری میں (کیونکہ وہ اُس وقت جیل میں تھے) فرعون مصر کے سامنے دیا تھا۔ مگر لوگوں نے آیت نمبر ۵۱ کو تو عزیز مصر کی بیوی کا قول کہا اور آیت نمبر ۵۲ اور نمبر ۵۳ کی باتوں کو یوسفؑ کا قول قرار دے دیا، حالانکہ اس کا کیا محل جبکہ وہ اس وقت جیل میں تھے۔ اور یہاں ان کی غیر حاضری میں فرعون کے سامنے مصر کی عورتوں کے بیانات ہو رہے تھے؟ بالکل اسی طرح ربوٰا کے سلسلے میں بھی ہوا کہ تاویل کرنے والوں کے قول کو دو ٹکڑے کر کے ایک کو انسانی قول اور دوسرے کو قرآنی حکم بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ نہ تو قرآن کا یہ حکم ہے اور نہ تاویلات کرنے والوں کا قول ہی ایسے محل میں ہے کہ اطلاق و عموم کے سوالات پیدا ہوں۔ دراصل یہ تاویل کرنے والوں کے قول ہی کا ٹکڑا ہے اور اس کا تعلق بھی حاجتمندوں ہی کے قرضوں سے ہے۔ لہٰذا اسے فی نفسہٖ حرمت ربوٰا کے ثبوت میں پیش کرنا صحیح نہیں۔ قرآن کہیں بھی فی نفسہٖ بڑھوتری کو ہرگز ممنوع قرار نہیں دیتا۔ اس مقام پر قرآن صرف یہ بیان کرتا ہے۔ کہ ممنوع ربوٰا لینے والوں کی یہ تاویل ہوتی ہے جو بیچ رہے ہے اور پھر کہتا ہے کہ پہلے جو ہو چکا سو ہو چکا۔ خدا کی طرف سے نصیحت پہنچنے پر آئندہ ایسا نہ ہونا چاہیئے اور جو اس کے خلاف کرے گا وہ سزایاب ہوگا۔"

اس کے بعد مسلمانوں کو قانون آئی اور مرضیٔ ایزدی بتائی جاتی ہے کہ کن لوگوں سے بڑھوتری لینا ممنوع ہے۔ کہتا ہے کہ جہاں جن لوگوں کو اُن کی

ضرورت مندی کے سبب امداد (صدقہ) ملتا ہے۔ اگر وہ لوگ مزید اپنی ضروریات کے لئے قرض لیں تو اُن سے کوئی بڑھوتری نہ لی جائے۔ جب صدقہ کو بڑھانے اور ربٰوا کے نابود ہونے کا ذکر کیجائی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ جہاں امدادی موقع ہوگا وہاں ربوا نابود ہوگا اور امداد (صدقہ) کا سوال وہیں اور تب ہی پیدا ہوگا۔ جہاں اور جب زندگی کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کا مسئلہ آئے۔ اِس طور پر صاف ظاہر ہے کہ جو افراد ایسے ضرورت مند اور مفلوک الحال یا پریشان و قابلِ امداد ہوں کہ وہ صدقہ کے مستحق ہوں اور صدقہ کے ذریعہ اپنی ضرورتیں پوری کرتے ہوں۔ وہ اگر مزید ضرورتوں کے لئے کوئی رقم قرض لیں تو اس رقم پر ان سے کوئی ربٰوا نہیں لینا ہوگا۔ کیونکہ یہ ربٰوا لینا اسلام کی اس تعلیم و تاکید کے یکسر خلاف پڑتا ہے۔ جس میں قرآنی نظام متشکل نہ ہونے تک انسانی ہمدردی و اخوتِ اِسلامی کی بنا پر ضرورتمندوں کی حاجت روائی و امداد کو ہر خاص و عام پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ اسی لئے آگے کہا گیا کہ ایسے ناشکرے گنہ گار کو اللہ دوست نہیں رکھتا یعنی جو شخص اللہ کے فضل سے ایسا فارغ البال ہے کہ وہ ضرورتمندوں کی اِمداد کے لئے اُنہیں خدا کی خوشنودی کے پیش نظر صدقہ دیتا ہے پھر وہ ان ہی افراد کو جو رقم قرض دیتا ہے، اور اُس کو ربٰوا کے ذریعے بڑھانے کا بھی خیال رکھتا ہے تو اس سے بڑا ناشکرا اور گنہ گار کون ہوگا۔ چنانچہ پھر آگے کہا گیا

ہے، کہ:

(۱) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ (۲/۲۷۸)	اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور اگر مومن ہو تو جتنا ربوا ان کے ذمہ باقی رہ گیا ہے، اس کو چھوڑ دو۔
(۲) وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ (۲/۲۷۹)	اور اگر توبہ کر لو گے اور ربوا چھوڑ دو گے تو تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ دوسروں کا نقصان ہے نہ تمہارا۔
(۳) وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَیْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (۲/۲۸۰)	اور اگر مقروض پریشان حال ہو تو کشائش تک اس کو اصل رقم کی واپسی کے لئے مہلت دو اور اگر وہ اصل رقم بھی اس کو بخش دو۔ تو پھر کیا کہنے ہیں۔ کاش تم اس کے فوائد سمجھ سکتے۔

صدقہ کی تعریف کیا ہے؟ صدقہ وہ رقم ہے جو خدا کی خوشنودی کے لئے بلا کسی معاوضے کے امداداً کسی ضرورت مند کو خوشی سے دی جائے۔ خود قرآن نے تَصَدَّقُوْا کہہ کے ظاہر کر دیا ہے کہ صدقہ سے مراد بخوشی بخشش کی ہوئی رقم ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ صدقہ کن کا حق ہے؟ سو یہ بھی قرآن میں بیان کر دیا گیا ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ	صدقات حق ہے فقراء کا، مساکین کا

وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِى الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔

(۹/ ۲)

اور عاملین صدقات کا اور اُن کا جن کی تالیفِ قلب منظور ہو اور یہ خرچ ہونا چاہیئے غلاموں کو آزاد کرانے میں اور قرضداروں کے قرضوں کی ادائیگی میں اور فی سبیل اللہ کاموں میں اور مسافروں کی بہبود میں۔ یہ مدیں اللہ نے مقرر کردی ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

اب غور فرمایئے کہ مستحقین صدقہ وہ ہیں جو اپنی ضرورتوں اور پریشانیوں کے سبب ہر طرح مالی امداد و اعانت کے محتاج ہیں اور انتہائی تاکید و ترغیب اس امر کی ہے کہ اس کی ہر طرح امداد کرو۔ اور اس طرح کرو کہ اپنی ضرورتوں پر اُن کی ضرورتوں کو ترجیح دو، اُن کی حاجت روائی کو انسانی اور اسلامی فریضہ تصوّر کرو۔ اُن کو قرض دو اور جب تک وُہ فارغ البال نہ ہو لیں قرض کی وصولی کے لئے انتظار کرو۔ اُن سے مطالبہ نہ کرو بلکہ اُن کی خراب حالت اور مجبوریوں کے سبب ہو سکے تو وہ قرضوں کی رقم بھی اُن کو معاف کر دو۔ اُن پر تصدّق کر دو اور وہاں یہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ ربوا کو نابود کرتا ہے اور صدقہ کو بڑھاتا ہے۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ ربوا کی ممانعت کا تعلق ضرورتمند افراد سے ہے اور یہ حکم صرف حاجت مند

مقروضوں کے بارے میں ہے۔ اِس لئے کہ یہ انسانی ہمدردی اور اسلامی جذبۂ اخوت کے منافی ہے کہ جو لوگ ہماری امداد و بخشش (صدقہ) کے مستحق ہیں، وہی لوگ اگر ہم سے کوئی رقم قرض لیں اور ہم اُن سے ربوٰا لیں اور وہ مزید پریشانیوں میں مبتلا ہو جائیں۔ ہوشیار لوگوں نے "ربوٰا" کو "سود" بنا دیا۔ اِس سے یہ فائدہ ہوا کہ "سود" کے نام سے کوئی رقم نہ لے کر دوسرے ناموں سے مثلاً "منافعہ" یا "کرایہ" کہہ کر اُن سے بھی مزید رقم وصول کر کے "بڑھوتری" کو جاری رکھنے اور اعتراض ہونے پر تاویل کرنے کا موقع نکل آئے کہ وہ تو "سود" نہیں جو حرام ہے۔ وہ تو "منافعہ" یا "کرایہ" ہے جو حلال ہے۔ گویا حلال و حرام کا تعلق لفظ سے ہے۔ معنی سے نہیں۔ اصطلاح سے ہے روح سے نہیں۔

بہرکیف میرے نزدیک "الربوٰا" سے وہ خاص قسم کا نامعلوم سُود نہیں ہے، جس کا رواج جاہلیت کے عربوں میں تھا اور جس کا ذکر قرآن میں نہیں جو ہر بات کو بتفصیل بیان کرنے کا دعویدار ہے بلکہ اس سے مراد صرف وہ "بڑھوتری" ہے جو کبھی کہیں کسی حاجتمند اور مستحق امداد شخص کو کوئی رقم قرض یا مکان کرائے پر دے کر اُس سے وصول کیا جائے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ربوٰا کے نابود اور صدقے کے افزود والی آیت سے پہلے تمہیداً مستقلاً وہ لمبے لمبے رکوع میں خیرات و امداد و بخشش و حاجت روائی

کے بارے میں اِس قدر صراحت سے تاکید و ترغیب وارد نہ ہوتی۔ اور اس کے بعد نہ صرف اُن کو باقی ربٰوا کی رقم چھوڑ دینے بلکہ اصل راس المال کی ادائیگی کے لئے اُن کو کشائش کے زمانہ تک لا محدود مہلت دینے۔ بلکہ اصل رقم تک بخش دینے کی تاکید نہ کی جاتی لہٰذا ربٰوا کی ممانعت فی نفسہٖ نہیں کہ جہاں کہیں بڑھوتری ظاہر ہو وہ حرام ہو جائے اور نہ ربٰوا کی کوئی خاص قسم ہے۔ بلکہ ربٰوا کی جا ہے اس کی نوعیت جو بھی ہو ممانعت صرف اُن غریبوں سے ہے جو اپنی بنیادی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے قرض لیں اور اُس کی جامع تعریف یہ کی گئی کہ جو لوگ مستحق صدقہ یعنی محتاج امداد ہوں۔ اُن کے مقابلے اور معاملے میں ربٰوا نابود ہو جاتا ہے۔ اور صدقہ بڑھ جاتا ہے یعنی وہاں اُن کے معاملے میں انسانی جذبہ ہونا چاہیئے کہ بجائے ان سے فائدہ اٹھانے کے جتنا ہو سکے اُن ہی کو کچھ دینا چاہیئے، چنانچہ اسی لئے اس قانون کے ذکر سے پہلے یہ بیان بھی کر دیا گیا ہے کہ کچھ لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ "بیع" بھی تو "ربٰوا" ہی کی طرح ہے۔ پھر یہ کیا کہ اللہ نے اُن کے ساتھ "بیع" کو تو حلال قرار دیا اور "ربٰوا" کو حرام؟ یعنی حاجت مندوں سے ربٰوا لینے والوں کا کہنا تھا کہ اَیسے ضرورت مند لوگ اگر ہم سے خرید و فروخت کریں اور ہم

کو حق حاصل ہے کہ اپنے منافعے کے ساتھ ہم اُن سے بیع کا معاملہ کریں اور اس صورت میں جو "بڑھوتری" ہو تو کوئی جرح نہ ہو۔ لیکن اگر ہم اُن کو کوئی رقم بطور قرض دیں تو اس پہ بڑھوتری لینا حرام ہو جائے، یہ کیا بات ہوئی؟ جب اُن سے بیع جائز ہے تو ربٰوا کیوں حرام ہو؟ یہ کیا مذاق ہے کہ اللہ نے اُن سے بیع کے معاملے کو تو حلال قرار دیا لیکن ربٰوا کو حرام کر دیا؟

بہر کیف میرے نزدیک قرآن میں ربٰوا کو نی نفسہٖ کہیں بھی حرام قرار نہیں دیا گیا ہے اور نہ حرام قرار دیا جا سکتا تھا۔ اِس لئے کہ قرآن قیامت کے لئے ہے اور ہر ملک کے لئے ایک جامع ضابطۂ حیات اور اصولی رہنما بن کر آیا ہے جو ہر زمانہ کے سارے تقاضوں میں ہر ملک کے مسلمانوں کی رہنمائی کرے گا۔ وہ صرف چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے عربوں کا قانونِ زندگی بن کر نہیں نازل ہُوا ہے کہ محض اُن کے معاملات ہی کی رہنمائی کا حامل ہو اور نہ صرف وہاں کے لئے اور اُس وقت کے لئے قرآن نازل ہُوا ہے جہاں اور جبکہ قرآنی نظام متشکل و رائج ہو بلکہ قرآن ہر زمانہ اور ہر ملک میں انسانی جذبۂ ہمدردی اور اخوتِ اسلامی کے پیشِ نظر صرف اُس "بڑھوتری" کو ممنوع قرار دیتا ہے جو ضرورت مندوں، پریشاں حالوں اور مستحق امداد لوگوں کو دئے ہوئے قرضوں پر وصول کیا جائے۔ اور یہ مسئلہ قرآن نے بوضاحت

بیان کر دیا ہے ان کے علاوہ دوسری جگہوں اور دوسرے افراد وجماعت سے ربٰوا لینا حرام نہیں۔ خواہ وہ قرض لینے والے حکومت کے محکمے ہوں۔ یا تجارت پیشہ افراد یا جماعت۔

جہاں تک کہ محترم مقالہ نگار کے اس ذاتی مسئلے کا تعلق ہے کہ اُن کے پراویڈنٹ فنڈ میں ایک کثیر رقم (INTEREST) کی بھی ہے۔ میرے خیال میں انہیں اس مخمصے میں پڑنے کی ضرورت نہ تھی۔ (INTEREST) کا ترجمہ فارسی میں کیجئے تو بلاشبہ "سُود" ہو گا جس کا اطلاق ہمارے یہاں ممنوع فائدے پر ہوتا ہے۔ مگر اسے عربی میں ترجمہ کیجئے تو منافعہ، فائدہ، عائدہ، منفعت وغیرہ ہی ہو گا اور اگر خود انگریزی زبان کو لیجئے تو یہ لفظ عام ہے۔ لین دین ہی نہیں۔ دوسرے معاملات میں بھی یہ فائدے کے معنی میں مستعمل ہے۔ پھر یہ حرام کیوں ہو؟ اس لئے کہ اوّل تو قرآن میں فی نفسہٖ اور مطلقاً ربٰوا کو ممنوع نہیں قرار دیا گیا ہے۔ دوسرے "ربٰوا" کا فارسی میں ترجمہ "سُود" کرنا سوائے چکمہ بازی کے اور کچھ نہیں۔ اس کا صحیح ترجمہ "بڑھوتری" ہے۔ اور ساری "بڑھوتری" ناجائز ہو ہی نہیں سکتی۔ اس طور پر تو مسلمانوں کے تجارت وصنعت کے سارے کاروبار ٹھپ ہو جائیں گے۔ کیونکہ "بڑھوتری" سے کوئی چیز بھی خالی نہیں۔ غالباً اس کا ترجمہ عربی میں "منافعہ" کرنے کے بجائے فارسی میں "سود" اُن لوگوں نے کیا ہے جو غریبوں سے بھی "منافعہ" کے نام سے "بڑھوتری" لینے کو جائز بنانا چاہتے

تھے اور عربی میں ترجمہ کرنے سے اِس کی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔ تیسرے فاضل مقالہ نگار کے پراویڈنٹ فنڈ میں ر (INTEREST) کی جو رقم ہے۔ وہ ملکی مروجہ قانون کے مطابق ہے اور ملکی قانون کا احترام اور اُس پر عمل درآمد خود از روئے قرآن ازبس ضروری ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام وزیر اعظم مصر اور پیغمبر تھے اور مصری قانون جو اُن کے عہد میں رائج تھا۔ وہ فرعونی قانون تھا۔ اُنہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے پاس روک لینا چاہا تھا مگر زبردستی نہیں روک لیا تھا۔ کیونکہ فرعونی قانون کے مطابق کسی غیر ملکی شخص کو بلا کسی جُرم کے زبردستی مصر میں نہیں روکا جا سکتا تھا۔

مَاكَانَ لِيَاخُذَ اَخَاهُ فِي دِيْنِ الْمَلِكِ ۚ (١٢/٧٦) — وُہ وہاں کے بادشاہ کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو روک نہیں سکتے تھے۔

چنانچہ اُنہوں نے مروجہ فرعونی قانون کا احترام کیا اور اپنے بھائی کی غلے بوری میں غلہ ناپنے کا سرکاری پیمانہ رکھوا کے اُنہیں مجرم قرار دیا اور پھر روکا۔

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ۔ — اس طرح ہم نے یوسف کے لئے تدبیر پیدا کر دی۔

آج جو نظام عام طور سے ملک میں رائج ہے۔ اُس میں INTEREST کا غیر معمولی عمل دخل ہے۔ کوئی اجارہ کوئی زرپیشگی۔ کوئی رہن۔ کوئی ہینڈ

نوٹ غرض قرض کی کسی قسم کا کاغذ اس مروجہ قانون کے مطابق بلا انٹرسٹ جائز ہی نہیں ہوتا۔ پھر اس پر اگر مسلمانوں کا عمل درآمد نہ ہو تو اُن کا سارا نظام معاشرت ہی درہم برہم ہو جائے گا، اور پھر ان کا کوئی معاملہ ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ غیر قانونی کاغذ لکھوا کے نہ وہ کسی کو قرض دے کر وصول کر سکتے ہیں۔ نہ اُن کو کوئی قرض دے کر وصول کر سکتا ہے اور قرآن اس کا بھی حامی نہیں۔ کہ جہاں قرآنی نظام رائج نہ ہو وہاں کے مسلمان مروجہ ملکی قانون سے بغاوت کریں۔ لہٰذا ہمیں مروجہ ملکی قانون کا احترام اور اُن پر اطمینان سے عمل درآمد کرنا پڑے گا۔ اسی لئے قرآن نے مسلمانوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۔ (۲۲/۴۱)	وہ لوگ ہیں کہ جب اُنہیں ملک میں اقتدار حاصل ہو گا۔ تو وہ نظام صلوٰۃ قائم کریں گے، زکوٰۃ وصول کریں گے۔ لوگوں کو معروفات پر عمل کرنے کا حکم دیں گے اور وہ تمام امور کا فیصلہ اللہ کے قانون کے مطابق کریں گے۔

یعنی اگر اسلامی نظام قائم ہو گا تو اُس وقت قوانین ہی ایسے بنائے جائیں گے۔ جس میں معروفات پر عمل درآمد اور منکرات سے بچنے کی گنجائش ہو گی اور سارے احکام الٰہی اپنی پوری برکتوں کے ساتھ نافذ العمل ہو سکیں گے اور جب تک یہ نہ ہو مروجہ قانون کا احترام اور اس ہی پر عمل درآمد کرنا ہو گا اور ظاہر ہے کہ جب کہیں

کبھی نظام قرآنی قائم ہوگا۔ تو وہ نظام بلا استثناء تمام افراد انسانی کی بنیادی ضروریات زندگی کی کفالت و بہم رسانی کا ذمہ دار ہوگا اور کسی فرد کو ضرورت ہی نہ رہے گی کہ وہ اپنی ضروریات زندگی کے لئے لوگوں سے صدقہ یا اس کے بھی ناکافی ہونے کی صورت میں قرض لے کر "ربوا" کا سوال پیدا ہو مگر جب تک ایسا نہ ہو مروجہ ملکی قوانین و نظام ہی پر مسلمانوں کا بھی عملدرآمد ہوگا۔ جس کے لئے قرآن نے حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال پیش کر کے مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے اور معاملہ ختم کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن نے نزول کے وقت بھی سارے مروجہ سارے باطل نظام عرب کو بیک جنبش قلم نہیں بدلا تھا۔ بلکہ اعتدال و توازن کے ساتھ بتدریج قوانین الٰہیہ پر عمل درآمد کی مسلمانوں کو ترغیب دی تھی اور وہاں سے منکرات کا رواج آہستہ آہستہ ہی دور ہوا تھا۔ قطع نظر اس سے میرے نزدیک فاضل مقالہ نگار کے معاملے میں یہ مسئلہ زیر غور آتا ہی نہیں، کیونکہ وہ انٹرسٹ ایسی "بڑھوتری" ہے ہی نہیں جو کسی حاجت مند کو قرض دے کر اس سے وصول کی جارہی ہے یا کی جانیوالی ہے اور جسے قرآن نے "نابود" کیا یا ممنوع قرار دیا ہے۔

بہرکیف! مَیں نے جو کچھ قرآن سے "ربوا" کو سمجھا ہے۔ وہ پیش کر دیا ہے

اور اس کے پیش نظر مجھے محترم مقالہ نگار کے اس خیال سے پورا پورا اتفاق ہے کہ :

"ہمیں الربٰوا کو حاجت مندانہ اور صرفی قرضوں تک ہی محدود رکھنا چاہیئے اور صرف گمان کی بنا پر سود کی اور صورتوں کو حرام کر لینے کی تنگی میں نہ پھنس جانا چاہیئے"۔

البتہ مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ ایسا اُس وقت تک ہونا چاہیئے جب تک کہ :-

"اس کا ثبوت نہ مل جائے کہ ایّام جاہلیّت میں نفع آور کاموں کے لئے بھی سود پر قرض لیا جاتا تھا"

اور نہ میں اس کا ہم خیال ہوں۔ کہ

" اللہ تعالیٰ نے جو بڑھوتری حرام قرار دی تھی وہ، وہ تھی جس کو اُس وقت کے عرب ربٰوا کہتے تھے"۔

قرآن نہ تو عربوں کی تاریخ کا محتاج ہے کہ جب تک ان کی تاریخ نہ ملے آیت ربٰوا کا مفہوم ہی سمجھ میں نہ آئے اور نہ قرآن محض عربوں کیلئے نازل ہوا تھا۔ کہ اس میں صرف عربوں کے سودی لین دین اور معاملات و اصطلاحات سے بحث ہو۔ البتہ انہوں نے جو یہ غیر مشروط نتیجہ نکالا وہ درست ہے کہ

" اوّل الربٰوا سے وہ سود مراد ہے جو حاجت مندانہ اور صرفی

قرضوں پر لیا جاتا ہے اور دوم قرض کی ان قسموں کے علاوہ اور قسمیں بھی ہیں۔ مثلاً وہ جن کا روپیہ نفع آور کاموں میں لگایا جاتا ہے یا جو گورنمنٹ لیتی ہے اُن کے سود پر قرآنی حرمت عائد نہیں ہوتی۔"

اور اُن کا اپنی حکومت کو یہ مشورہ بھی درست ہے کہ:۔

" وہ سود جو حاجت مندانہ اور صرفی قرضوں پر لیا جاتا ہے یہ چونکہ حرام ہے۔ اس لئے گورنمنٹ کو ایسا انتظام کرنا چاہیئے کہ ایسے قرض لوگوں کو بغیر سُود کے مِل جائیں۔"

رہا فاضل مقالہ نگار کی یہ تلاش و جستجو کہ اس بارے میں لوگوں کا کیا خیال ہے؟ سو میری دانست میں لوگوں کا خیال کسی دینی معاملے میں سند و حجت نہیں اس لئے کہ بقولِ قرآن لوگوں کا خیال عام طور سے صحیح نہیں ہُوا کرتا:

(۱) وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔ (۷/۱۸۷) بلکہ اکثریت اُن کی ہے جو کوئی علم نہیں رکھتے۔

(۲) وَلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ۔ (۶/۱۱۲) بلکہ اکثریت اُن کی ہے جو کچھ نہیں جانتے۔

(۳) مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ۔ (۵۳/۲۸) اُن کے پاس علم میں سے تو کچھ ہے نہیں، بس وہ تو صرف قیاس پر چلتے ہیں۔

(۴) وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ملک میں اکثریت تو اُن ہی کی ہے کہ اگر تم اُن کا کہا مان لو تو وہ تمہیں خدا کی راہ سے

اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ۔ (۶/۱۱۶)

بھٹکا دیں گے۔ کیونکہ وہ تو صرف قیاس کی پیروی کرتے اور محض اٹکل دوڑاتے ہیں۔

لوگوں کا تو خیال ہے کہ کسی کا باپ اپنے باپ کی موجودگی میں مر جائے۔ تو اس جرم میں کہ کیوں اُس کا باپ اپنے باپ سے پہلے مر گیا۔ وہ دادا کی جائیداد میں وراثت پانے سے محروم ہو جاتا ہے۔ تو کیا اس خیال کو صحیح مان لیا جائے گا۔ لوگوں کا تو کہنا ہے کہ کسی جنگ میں دشمن کے آدمی گرفتار ہوں تو اُن کے مرد غلام بنائے جائیں گے اور عورتیں بلا قید تعداد اور بغیر نکاح مصرفی لونڈیاں بنیں گی۔ تو کیا اس خیال کو صحت کی سند دے دی جائے گی؟ دراصل دینی معاملات میں دیکھنے کی چیز اور جاننے کا مسئلہ صرف یہ ہے کہ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے؟ اور یہ صرف قرآن ہی سے معلوم ہو گا۔ کیونکہ خدا کا حکم خدا کی کتاب میں ہے، لہٰذا ضرورت قرآن کو دیکھنے کی ہے۔ جس مسئلے میں قرآن جو رہنمائی کرے وہی صحیح ہے۔ چاہے وہ لوگوں کے خیال سے کتنا ہی مختلف نظر آئے اور چونکہ قرآن نے اعمال کی ذمہ داری ہر فرد بشر پر ذاتی طور سے رکھی ہے لہٰذا قرآن کی رہنمائی بھی ہر شخص کے بس کے اندر کی بات ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ قرآن میں دئے ہوئے احکام پر عمل کی ذمہ داری تو ہر فرد پر ذاتی حیثیت سے ہو لیکن رہنما قرآن کا سمجھنا دوسروں کے لئے مخصوص ہو۔ وہ کوئی علمی و فنی کتاب نہیں کہ مصطلحاتِ علم و فن جاننے والے کی محتاج ہو۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو خدا سے ڈرے اور خدائی مرضی معلوم کرنا چاہے اُسے بخوبی پڑھ

اور سمجھ سکتا ہے چاہے وہ ترجمے ہی سے کیوں نہ ہو۔ کیونکہ خود قرآن کا بڑا حصہ ترجمہ ہی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے عہد تک کے سارے اقوال، سارے مکالمے اور ساری دعائیں عربی میں ترجمہ ہیں اصل نہیں لہذا ہمیں تمام مسائل حیات میں صرف قرآن کو خود ہی رہنما بنانا چاہیئے۔ لوگوں کے خیالات کی تلاش اور وہ بھی کسی قطعی فیصلے پر پہنچنے کے لئے (بقول پروفیسر عبدالباری ندوی پروفیسر جامعۂ عثمانیہ) بالکل فضول ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

غم و غصہ دونوں زیادہ مسلمانوں کے حال پر آتا ہے جو اس زندہ کتاب پر ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں اور پھر زندگی کا راستہ دوسروں سے پوچھتے اور اِدھر اُدھر ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ اُن کو تو صرف اِس کی ضرورت تھی کہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں بس اس ایک کتاب کو بطور ایک زندہ کتاب کے استعمال کرتے۔

کہنے کی بات نہیں۔ مگر آپ سے کہہ دینے کو جی چاہتا ہے کہ میرا تو یہ حال ہو گیا ہے کہ لغت اور زبان کے اعتبار سے معانی سمجھ لینے کے بعد جہاں اور جس مقدار میں اس کلام اللہ کے ساتھ تفسیر وغیرہ کی صورت میں کلام الناس کو شریک کیا۔ اسی قدر نہیں بلکہ زیادہ تر ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ جو روشنی ملی تھی اُس کی جگہ پھر تاریکی چھانے لگی۔"

(مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں صفحہ ۲۵-۲۶)

یہی قرآن کا بھی کہنا ہے کہ کسی بات کو جاننے کے لئے قرآن سے باہر جانے کی

کسی کو ضرورت ہی نہیں ۔
وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا
الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰى
اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (١٧/٨٩)

اور بلاشبہ ہم نے تمام بنی نوع انسان کے لئے اس قرآن میں ساری باتیں تفصیل سے بیان کر دی ہیں۔ مگر اکثر لوگ وہی ہیں جو اس حقیقت کا انکار کئے بغیر نہیں رہتے۔

(مطبوعہ:۔ اشرف پریس لاہور)

ماہنامہ "ثقافت"

[ادارۂ ثقافت اسلامیہ پاکستان کا ترجمان]

پاکستان میں اپنی نوعیت کا واحد دینی اور علمی رسالہ جس میں صرف مفکرین کے تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس کے عمومی مباحث یہ ہوتے ہیں:

- معاشرے کے حقیقی مسائل پر اصولی بحث
- معاشرے کے بنیادی اقدار اور دین صحیح کی پیشکش
- دین کی روشنی میں حیات جدیدہ کی تشکیل
- وحدت فکر اور وحدت انسانی کی دعوت
- اسلاف کے گرانقدر خدمات اور علمی سرمائے سے استفادہ
- تاثرات

صفحات ۸۰ - فی پرچہ ۱۲ آنے

سالانہ چندہ آٹھ روپے - بذریعہ وی پی ساڑھے آٹھ روپے

محکمہائے تعلیم سے منظور شدہ

■

محمد اشرف ڈار

سیکرٹری، ادارۂ ثقافت اسلامیہ پاکستان

نرسنگھ داس گارڈن - ۲ کلب روڈ - لاہور

گلستان حدیث

مولانا محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی

فاضل مؤلف نے اس پیشکش میں اپنے ذوق کے
مطابق چند احادیث منتخب کی ہیں اور ان کی
تشریح کرنے میں اپنے دور کے ضروری اقدار کو
بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اس انتخاب کو پڑھنے کے
بعد [illegible] ہوگا کہ حضور اکرم کے 'معلم
ک[illegible] کمت' ہونے کا کیا مطلب ہے اور
[illegible] رانیہ سے صحیح احادیث کس قدر مطابقت
[illegible] ھتی ہیں۔

صفحات ۲۰۸ قیمت دو روپے آٹھ آنے

—○—

مقامی تاجران کتب سے خریدیں یا براہ راست ادارہ کو لکھیں